سیماب اکبرآبادی کی شاعری کا تجزیاتی جائزہ

تلخیص

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

نگراں

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ہاشم

ریسرچ اسکالر

فرحت زہرا

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔پی) انڈیا

۲۰۱۱ء

میرے تحقیقی مقالے کا موضوع ''سیماب اکبرآبادی کی شاعری کا تجزیاتی جائزہ'' ہے۔ سیماب صاحب انیسویں صدی کے ربع آخر یعنی ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد (آگرے) میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے نصف اول کے اختتام تک اردو ادب کے افق پر خوب چمکے۔ وہ بہت وسیع المطالعہ اور کثیر جہتی شخصیت کے مالک تھے۔ تاریخ، تہذیب، سیاست، خطابت، مذہب، ادب اور زبان غرض ہر میدان کے ماہر تھے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جن میں غزل، نظم، رباعی اور مرثیہ وسلام شامل ہیں۔ شروع میں انھوں نے غزلیں لکھیں اور اصلاح کے لئے داغؔ کو استاد بنایا، لیکن وہ نظم کی اہمیت ومقبولیت سے بھی بے خبر نہیں تھے اور انھیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ ''عہد حاضر میں نظم، غزل سے زیادہ اہم اور کارآمد صنف سخن ہے۔'' چنانچہ انھوں نے مختلف ومتنوع موضوعات پر سینکڑوں نظمیں لکھیں اور آزادؔ اور حالیؔ کی جو روایت شبلیؔ، اکبرؔ، اسماعیل میرٹھیؔ وغیرہ کے توسط سے ان تک پہنچی تھی اسے پورے فنکارانہ کمال کے ساتھ انھوں نے آگے بڑھایا اور اس میں امتیازی مقام حاصل کیا۔

نظم نگاری میں ان کے امتیازات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری سمجھا گیا کہ باب اول کے طور پر نظم کے آغاز اور عہد سیماب تک اس کے ارتقا سے متعلق ضروری معلومات بھی پیش کردی جائے تاکہ موضوع کا تسلسل برقرار رکھنے اور اس ارتقا کے لازمی نتیجے کے طور پر سیماب کی نظم نگاری کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

اردو میں نظم نگاری کا سلسلہ حضرت امیرؔ خسرو سے قلی قطب شاہ اور ولی وغیرہ سے ہوتا ہوا نظیر اکبرآبادی تک پہنچتا ہے، پھر ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں محمد حسین

آزاد کی کوششوں اور کاوشوں کے نتیجے میں اس صنف کی تجدید ہوئی۔ اسی لئے اسے نظم جدید کے نام سے یاد کیا گیا اور اس نے باقاعدہ طور پر ترقی یافتہ صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کی آبیاری الطاف حسین حالؔی، شبلؔی، اکبرؔ، اسماعیل میرٹھؔی وغیرہ نے کی، انھوں نے مختلف و متنوع موضوعات پر نظمیں لکھ کر اردو نظم کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ پھر یہ سلسلہ سرور جہاں آبادی، چکبستؔ، اقبالؔ، جوشؔ وغیرہ سے ہوتا ہوا سیمابؔ تک پہنچتا ہے، جنھوں نے اپنی اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیتوں سے نظم کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ زیرِ نظر باب میں اسی موضوع پر کلام کیا گیا ہے۔

مقالے کا دوسرا باب سیماب کی نظم نگاری کے تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے۔ سیماب کی نظموں کے چار مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''نے ستاں'' ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا، دوسرا مجموعہ ''کارِ امروز'' اول الذکر کے دس سال بعد یعنی ۱۹۳۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ تیسرا مجموعہ ''ساز و آہنگ'' ۱۹۴۱ء میں اور چوتھا مجموعہ ''شعرِ انقلاب'' ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اول الذکر مجموعہ ''نے ستاں'' ان کی مختلف النوع نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس کے چار حصوں میں سے شروع کے دو حصوں ''حجازیّات'' اور ''اسرار'' کے تحت ان کی مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ جن میں ترانۂ وحدت، خورشید رسالت، گھٹا مدینے سے، گنبدِ سبز رسول اللہ، استغاثہ (دربارِ رسول میں)، عید قرباں اور فریاد وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور حمد و نعت میں مستغرق نظر آتے ہیں۔ ''اسرار'' میں خاص طور پر ان کی عرفانی نظمیں ہیں جو تصوف کے اعلیٰ و ارفع جذبات و خیالات سے معمور ہیں۔ چنانچہ بادۂ عرفاں کا پہلا دور، عرفان نفس، دعوت روح، ہمہ اوست، تو ہی تو ہے اور دھکوڑی کا محویت خانہ ان میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ بقیہ دو حصوں محمل اور جنت کے خطوط، مناظر فطرت، تاج اور

ارض تاج سے متعلق اور متفرق موضوعات پر مبنی ہیں۔ ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''کارِامروز'' ہے جس میں سیاسی، قومی و وطنی اور عشقیہ موضوعات اور اہم شخصیات پر نظمیں شامل ہیں۔

سیاسی نظموں میں طلوع سیاست، بساط سیاست، انقلاب روس، جذب وسلوک، آزادی، بلراج کو ہمارا مشورہ وغیرہ شامل ہیں۔ رسول کائنات، گوتم بدھ، سری کرشن، گاندھی، نظیر اکبرآبادی، غالب، داغ، محمد علی، میر ناصر علی خاں وغیرہ نظموں سے مختلف شخصیات سے سیماب کے تعلق وعقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ نظیر و غالب میں شاعرانہ عظمت کے علاوہ وطنی نسبت پر بھی فخریہ جذبات حاوی ہیں۔

صبح محبت، نزول انسان، انسانیت، ایک پیغام۔ اہل عالم کے نام، اساس کائنات، امتحان شیخ و برہمن، بھولے ہوئے فسانے اور اس طرح کی متعدد نظموں میں سیماب نے آپسی اتحاد و بھائی چارگی، اور اخوت ومحبت کا پیغام دیا ہے۔ میرا وطن، آزادی، کانگریس، رہنما، نوجوان ہندوستانی سے، ہندوستانی ماں کا پیغام وغیرہ نظمیں اپنے وطن کی محبت، اس کی ترقی کی فکر وکوشش اور اس کے لئے جانبازی و جانثاری کا جذبہ وولولہ پیدا کرنے والی نظمیں ہیں۔ اس حصہ کی متعدد نظمیں حسن اور عشق ومحبت کے جذبات سے مملو ہیں تو بعض دیگر متفرق موضوعات پر تخلیق کی گئی ہیں۔ اس مجموعہ کا آخری حصہ جناب سیماب نے اپنے وطن اکبرآباد (آگرہ) کی تاریخی حیثیت وعظمت اور سلاطین مغلیہ کی عمارتوں اور یادگاروں پر اظہار عقیدت ومحبت کے لئے وقف کیا ہے۔ اس حصہ کا عنوان ''ارض تاج'' ہے۔ اس کے تحت درج ذیل نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ تاج محل، قلعہ معلیٰ، مسجد جامع، اعتمادالدولہ، چینی کا روضہ، آرام باغ، جمنا، سکندرہ، فتح پورسیکری، مزار اکبر، درۃ التّاج، دیال باغ، جودہ بائی کا مندر،

روضۂ ممتاز اور مقبرۂ نور جہاں، تاج (شب تاریک میں)، مولد غالب اور قصر الادب یعنی مولد سیماب اکبر آبادی۔ ان مقامات سے متعلق شاعر نے انتہائی محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ سبھی آثار بجائے خود بہت بلند و بالا حیثیت کے حامل ہیں اور ان میں اپنے حسن بیان سے سیماب نے جو شیرینی اور چاشنی پیدا کی ہے اس نے پڑھنے والوں کے لئے ان کے جمالیاتی حظ و کیفیت کو مضاعف کر دیا ہے جس کی تفصیلات زیر گفتگو باب میں موجود ہیں۔ اپنے مکان قصر الادب پر سیماب کی نظم بڑی معنی خیز اور پُر کیف ہے۔ اس میں آگرے کی تاریخی و ادبی حیثیت کے پس منظر میں اردو کے شعرا میرؔ و غالبؔ کے بعد خود اپنے وجود پر فخر کیا ہے اور ان دونوں عظیم شعرا کی تاریخ پیدائش کے زمانی فاصلے سے یہ دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے کہ میرؔ کی پیدائش کے ستاسی سال بعد غالبؔ پیدا ہوئے اور غالبؔ کی ولادت کے ٹھیک ستاسی سال بعد ہی اسی آگرے میں سیماب کی ولادت ہوئی۔ اس طرح عماراتی حسن و رعنائی کے ساتھ ساتھ اس شہر یعنی ارض تاج کے حسن کا سبب یہ بھی ہے کہ اس سرزمین سے یہ عظیم الشان ادبی گہر ہائے آبدار بھی برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے اس طرح کے ادبی و جذباتی بیانات مجموعۂ زیر نظر کے حسن میں اضافے کا سبب بن گئے ہیں۔

تیسرے مجموعے ''ساز و آہنگ'' کو سیماب نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں نوائے عصر کے تحت قومیت، سیاست، وطنیت پر نظمیں لکھی ہیں۔ حصہ دوم میں صلائے تہذیب کے تحت مذہب، اخلاق و معاشرت پر نظمیں ہیں۔ حصہ سوم میں حدیث ادب کے تحت شعر و حکم پر نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں سیماب نے اپنے اعلیٰ و ارفع خیالات کو فنکارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ ان کے تخلیقی ذہن و مزاج کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ سیماب نے حصہ چہارم میں سرودِ روح کے جلی عنوان اور معتقدات کے خفی عنوان کے

تحت نظموں میں مذہبی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں ''ابنِ آذر''، ''ابنِ عمران''، اور ''ابنِ مریم'' وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ سیماب نے ان نظموں میں مذکور شخصیات کے کردار اور مکارم اخلاق کو شاعرانہ انداز میں بہت خوبی سے پیش کیا ہے، اور ان کے توسط سے شرک و بدعت جیسی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حصہ کی دیگر اہم نظموں میں معراج النبی اور ایک لمحۂ فکریہ، صبح حرم، شام کلیسا، سلطان شہید، میرا خطاب، سری کرشن، وہ بانسری کہاں ہے اور گرونانک وغیرہ ہیں۔ حصہ پنجم میں سیماب نے بچوں سے متعلق نظمیں پیش کی ہیں۔ یہ نظمیں بچوں کی ذہنی نشوونما کے لئے ان کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

سیماب کی نظموں کا چوتھا مجموعہ ''شعرِ انقلاب'' ہے۔ اس کی اشاعت ہندوستان کی آزادی کے سال یعنی ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ سیماب کے کلام میں اس کی خاص اہمیت و انفرادیت ہے۔ اس میں ان کے فکر و فن کے متعلق ارتقائی بلندیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعے ''کارِ امروز'' میں جذبۂ حب الوطنی اور اعلیٰ سیاسی اقدار کی فنکارانہ پیش کش کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، تیسرے مجموعے ''ساز و آہنگ'' میں اس کی لے مزید تیز ہوگئی تھی۔ ''شعرِ انقلاب'' میں شاعر کی فکر میں مزید بلندی اور شدت پیدا ہوگئی۔ اس میں اس عہد کے مسائل پر سنجیدہ توجہ دیتے ہوئے سیماب نے سماج کی کمزوریوں پر سخت تنقید کی ہے۔ اہل وطن کو منفی فکر کو ترک کرنے کی ترغیب دی ہے۔ دوسروں پر تنقید کے بجائے اپنی ذات و معاشرے کی اصلاح کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ مزید برآں سماج و سیاست کی خرابیوں و خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح و بہتری کی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً ہندوستان کی عظیم الشان تاریخی یادگاروں پر فخر کرتے ہوئے شاعر نے یہاں غربت و افلاس کا سبب موجودہ مکینوں کی بے عملی اور پست ذہنیت کو قرار دیا ہے۔

بھوکے ہیں خود ہندوستانی بھوکا ہندوستان نہیں

بھوکا ہندوستان کو کہنا آگاہی کی شان نہیں　　بھوک ہے یہ روحانیت کی، بھوکا ہندوستان نہیں

پورے مجموعے میں اپنے اندرون کا جائزہ لینے اور اپنے ملک ہندوستان کو ہر طرح بلند و بالا سمجھنے پر زور دیا ہے۔ خطابت کے ساتھ ساتھ یہ پوری ادبی شان کا بھی حامل ہے۔

مقالے کا تیسرا باب سیماب کی غزل گوئی کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے ''کلیم عجم''، ''سدرۃ المنتہیٰ'' اور ''لوحِ محفوظ'' ہیں۔ ''کلیم عجم'' دراصل ان کے چودہ خطبات شاعری کا مجموعہ ہے۔ اسی کے ساتھ اور اسی عنوان سے سیماب نے تین حصوں پر مشتمل پہلا مجموعۂ غزلیات بھی شامل کر دیا ہے۔ اس طرح اس جلد میں غزلیات کے تین حصے ''صہبائے کہن''، ''بادۂ دوشیں'' اور ''نشید نو'' شامل ہیں۔ انھوں نے غزل میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل و موضوعات کو بھی داخل کیا، بہت سی جگہ روایت سے انحراف بھی کیا اور اس صنف کو غیر ضروری جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے نئی تحریکوں اور بدلتے ہوئے نظام سے متعلق موضوعات سے آشنا کیا۔ سیماب نے ندرتِ خیال، جدتِ بیان اور شگفتہ طرزِ ادا سے اپنی غزلوں کو نئی آب و تاب بخشی۔

مقالے کے چوتھے باب میں رباعیات سیماب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان رباعیات میں انھوں نے عصری زندگی کی پیچیدگیوں، ناہمواریوں اور پریشانیوں کو بیان کیا ہے۔ سیماب نے اپنی رباعیوں میں مذہب، سیاست، جمہوریت، جنگ کی صورتِ حال، وطن پرستی، ہندوستان پر غیروں کے ظلم و جبر، مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں، مسلکی اختلافات سبھی پر اظہار خیال کیا ہے۔ خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے سبب جس طرح کا انتشار، بدامنی اور

غیر محفوظ زندگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ ان کی رباعیات میں بہت نمایاں ہیں۔ سیماب کی رباعیات کا مجموعہ ''عالم آشوب'' فنی بلندی کے مقابلے میں تاریخی حیثیت زیادہ رکھتا ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے اواخر مئی ۱۹۴۰ء سے اواخر دسمبر ۱۹۴۳ء تک کے سارے حالات بالترتیب قلم بند کئے ہیں۔ اس مجموعہ میں انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے وقت کے سیاسی حالات پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ عالمی جنگ کے زمانے میں سیماب اکبرآبادی کی نظر محض جنگ کے حالات پر ہی مرکوز نہیں تھی بلکہ ان کی ہمہ گیر نگاہ حالات کے دیگر پہلوؤں پر بھی تھی۔ اس زوال آمادہ دور میں انھیں سیاست، مذہب، سب مجہول دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں مغرب کے حکمرانوں کی دورنگی چالوں کا بھی ادراک ہے جو ظاہرداری کے لئے امن و صلح کی باتیں کرتے ہیں، اور انھیں کی سازش کے تحت عالمی جنگ برپا ہوئی جس کے نتیجے میں غریب اور محکوم اقوام و ممالک کو سنگین خمیازہ بھگتنا پڑا۔

مقالے کے پانچویں باب میں سیماب کی عزائی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نظم جدید کے آغاز کے بعد جدید تقاضوں کے تحت اردو کی جن دوسری شعری اصناف میں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں ان میں مراثی اور سلام بھی شامل تھے۔ سیماب نے مرثیوں اور سلاموں کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ان کے موضوعات و اسالیب میں بھی تنوع پیدا کیا اور اپنی شاعرانہ مہارت اور فنی پختگی کا ثبوت دیتے ہوئے عزائی شاعری پر مشتمل دو مجموعے ''سرودِ غم'' اور ''نفیر غم'' ۱۹۴۳ء میں شائع کئے۔ ان مجموعوں میں مذہبی عقیدت مندی اور جذباتیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ فن کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ مرثیے اور سلام سیماب کے مجموعوں کی اشاعت کے بعد کے سبھی شعرا کے لئے رہنما ثابت ہوئے اور بعد کا کوئی شاعر ان کے اثرات سے دست برداری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

اس لحاظ سے سیماب کی عزائی شاعری اردو ادب میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوگئی ہے۔

مقالے کا چھٹا باب سیماب کے منظوم تراجم بہ عنوان ''وحیِ منظوم'' اور ''الہامِ منظوم'' پر مشتمل ہے۔ اول الذکر میں سیماب نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور ہر آیت کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ جس سے واضح طور پر ان کی عربی دانی اور قرآن پاک سے شغف کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علامہ سیماب نے ''وحیِ منظوم'' میں جہاں ترجمے کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ نظر رکھا ہے وہیں ترجمہ کرتے وقت شاعری کے رموز و نکات سے بھی انحراف نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ ترجمہ اس احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کیا ہے کہ قرآنی متن کے تمام تقاضے پورے ہوں اور ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی بنائی کہ شعریت میں کوئی کمی محسوس نہ ہو۔ انھوں نے پورے تیس پاروں کا ترجمہ ایک ہی بحر میں کیا ہے۔ ترجمہ کی خاطر زائد الفاظ کو قوسین میں جگہ دی اور جہاں کہیں ضرورت پڑی تو انھوں نے پورے مصرعے کو قوسین میں درج کیا ہے۔ سیماب کے اس ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت سلاست، روانی اور اختصار و جامعیت ہے۔ یہ صفات قرآن پاک کے دوسرے تراجم میں موجود نہیں ہے۔

قرآن پاک کے ترجمہ ''وحیِ منظوم'' کے علاوہ سیماب نے مشہور مفکر اور فارسی کے عظیم شاعر مولانا جلال الدین رومی کی معرکہ آرا تخلیق ''مثنوی معنوی'' یا ''مثنوی مولانا روم'' کے چھ حصوں کا منظوم ترجمہ بھرپور فنکارانہ مہارت کے ساتھ کیا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اس مثنوی کے متعدد تراجم کئے گئے تھے۔

علامہ سیماب نے ترجمہ ''الہام منظوم'' نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کیا اور الہامی افکار کو اس خوبی سے اردو نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے کہ ان میں اس فنی نادرہ کاری کا

اپنا الگ امتیاز قائم ہوگیا ہے۔ اردو میں صحت زبان کے ساتھ ساتھ صحت مفہوم کو واضح طور پر ادا کرنے کی کوشش سیماب نے نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منظوم ترجمہ محض ترجمہ نہیں رہ جاتا بلکہ خود ایک شاہکار تخلیق کے روپ میں ڈھل جاتا ہے، جس میں بلا کی شعریت، معنویت اور کشش نظر آتی ہے۔ یہی باتیں سیماب کے ترجمے کو دیگر تراجم کے مقابلے ممتاز بناتی ہیں۔ یہ شعری کارنامہ ان کی زبردست شاعرانہ عظمت اور کلاسیکی فارسی ادب پر گہری نظر اور فارسی زبان سے مہارت کا واضح ثبوت ہے۔

مقالے کا ساتواں باب ''سیماب کی زبان اور طرز ادا'' سے متعلق ہے۔ سیماب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی ادبیات سے بھی گہرا شغف ہونے کی وجہ سے ان کے پاس ذخیرۂ الفاظ بھی غیر معمولی تھا۔ زبان کے حسب دل خواہ استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ سادگی، پرکاری، نغمگی وموسیقی اور محاسن شعری کے استعمال پر بھی انھیں بھرپور عبور تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان تمام رموز ونکات کو پیش نظر رکھا ہے جو ان کی اختیار کردہ اصناف سے متعلق شعری آداب کا تقاضا ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں فنی چابکدستی، تخیل کی بلندی اور ندرتِ ادا قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ الفاظ کی ترکیب وترتیب نے ان کے یہاں ادبی حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اپنے پورے کلام میں انھوں نے فارسی اور اردو تراکیب سے مانوس ومقبول تراکیب کا اضافہ کیا جس سے ان کی شاعری میں نغمگی وترنم خوب سے خوب تر ہوگیا۔ موضوع، مواد اور فضا کی مناسبت سے زبان واسلوب اختیار کرنے اور اسے مؤثر بنانے میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ غرض مجموعی طور پر ان کے پیش کردہ موضوعات، ان کی اختیار کردہ اصناف اور پیش کش کے نت نئے اور مؤثر طریقوں کے پیش نظر جدید اردو شاعری میں سیماب اپنا منفرد وممتاز مقام رکھتے ہیں۔

مقالے کے آخر میں کتابیات کے تحت بنیادی ماخذ، ثانوی ماخذ، رسائل و جرائد سے متعلق فہرست کو پیش کیا گیا ہے۔

سیماب کی شاعری کے جائزے سے متعلق یہ ناچیز کوشش، مقالہ نگار کی کمزوریوں اور نارسائیوں کے باوجود اپنے موضوع پر ایک جامع مطالعہ ہے اور امید ہے کہ اردو ادب میں یہ اہم اضافہ ثابت ہوگا۔ نیز اس کے نتیجے میں سیمابیات کے باقی مطالعے کے لئے نئے دروازے کھلیں گے۔

SEEMAB AKBER ABADI KI SHAIRI KA TAJZIYATI JAIZA

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

SUBMITTED BY

FARHAT ZEHRA

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. Dr. Syed Mohammad Hashim

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2011

سیماب اکبرآبادی کی شاعری کا تجزیاتی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

نگراں

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ہاشم

ریسرچ اسکالر

فرحت زہرا

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔پی) انڈیا

۲۰۱۱ء

Centre of Advance Study
Department of Urdu

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202002 (India)

Dated: 11.11.2011

CERTIFICATE

This is to certify that this thesis entitled **"SEEMAB AKBER ABADI KI SHAIRI KA TAJZIYATI JAIZA"** submitted by **Farhat Zehra** is an original research work, done under my supervision and has not been submitted for any other degree of this or any other university.

It is now being forwarded for the award of Ph.D. degree in Urdu language and literature.

(Prof. Mohammad Zahid)
Chairman

(Prof. Dr. Syed Mohammad Hashim)
Supervisor

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

اپنے والد محترم ذیشان احمد (مرحوم) علیگ

اور

اپنی والدہ محترمہ مختار فاطمہ (مرحومہ)

کے نام

جن کے فیضانِ تربیت سے میں یہاں تک پہنچی اور
جن کی یادیں ہی اب میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

فہرست

مقدمہ ۱۔۶

باب اوّل : اردو نظم کا آغاز و ارتقاء — سیماب اکبر آبادی تک ۷۔۵۱

باب دوم : سیماب کے نظمیہ مجموعوں کا مطالعہ ۵۲۔۱۵۵

(الف) نے ستاں

(ب) کارامروز

(ج) ساز و آہنگ

(د) شعرِ انقلاب

باب سوم : سیماب کی غزل گوئی ۱۵۶۔۱۸۳

(۱) کلیم عجم

(۲) سدرۃ المنتہیٰ

(۳) لوحِ محفوظ

باب چہارم : رباعیات سیماب ۱۸۴۔۲۰۱

باب پنجم : سیماب کی عزائی شاعری ۲۰۲۔۲۱۴

باب ششم : سیماب کے منظوم تراجم ۲۱۵۔۲۵۰

(الف) وحیِ منظوم

(ب) الہامِ منظوم

باب ہفتم : سیماب کی زبان اور طرزِ ادا ۲۵۱۔۲۶۶

کتابیات ۲۶۷۔۲۷۸

سیماب اکبر آبادی جدید اردو شاعری اور خاص طور سے اردو نظم نگاری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں آزاد اور حالی کی کوششوں کے نتیجے میں انجمن پنجاب کے قیام کے بعد جدید نظم کا جو سفر شروع ہوا تھا اس سے انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز تک اردو میں نظم نگاری کا پورا ماحول تیار ہو گیا اور اس نے ارتقائی مراحل طے کئے۔ اس زمانے میں ایک طرف غزل میں طرزِ امیر و داغ کی پیروی کی کوشش جاری تھی تو دوسری طرف اردو میں انگریزی ادبیات کے اثرات بتدریج بڑھتے جا رہے تھے۔ آزاد، حالی وغیرہ نے اپنی محنت و کوشش سے قومی اور نیچرل شاعری کو مکمل طور پر قابلِ قبول اور پسند عام بنا دیا تھا۔ اس کے بعد اس صنف میں دوسرے موضوعات بھی شامل ہوتے گئے اور ان موضوعات پر بہ کثرت نظمیں لکھی گئیں۔ گویا پورے دور پر نظم حاوی رہی۔ اس سلسلے کی دوسری اور تیسری نسل میں سیماب اکبر آبادی شامل ہیں جنھوں نے نظم میں روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے فکر و فن اور جدید طرزِ اظہار سے نظم کو مزید بلندیوں تک پہنچایا۔ صرف نظم ہی میں نہیں غزل، رباعی، مرثیہ و سلام اور منظوم تراجم میں بھی سیماب صاحب نے زبردست کارنامے انجام دیئے۔ ان کی اس شاعرانہ عظمت کو دیکھتے ہوئے شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے استاد محترم پروفیسر محمد ہاشم صاحب کی نگرانی میں اس موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کا کام کرنے کی خدمت میرے سپرد کی۔

سیماب کی ہمہ جہت شخصیت اور مختلف النوع اصناف و اسالیبِ شاعری پر ان کی قدرت و مہارت اور ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ان کے وسیع سرمایۂ ادب کے پیش نظر ان کے سلسلے میں موجود مواد کے علاوہ نایاب اور کمیاب مواد کی فراہمی انتہائی مشکل کام ہو گیا تھا۔

جس کے لئے مجھے مختلف قسم کی غیر معمولی دشواریوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سی مطبوعہ کتابیں اور ان کے مجموعے کہیں دستیاب نہیں ہو رہے تھے، سیماب اکبر آبادی کے پوتے جناب افتخار امام صدیقی مدیر ''شاعر'' نے اس سلسلے میں حتی المقدور تعاون کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی معذوری اور ناسازی طبع کے سبب حسب خواہش وہ میری مدد نہیں کر سکے جس کا انھیں بھی بار بار احساس رہا۔ لیکن تعاون کر کے مجھ پر انھوں نے زبردست احسان کیا اور الحمد اللہ اب میرا یہ تحقیقی مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کام کی ترتیب کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

مقالۂ ہٰذا کو میں نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے:

پہلا باب اردو نظم کے آغاز وارتقا سے متعلق ہے۔ سیماب اکبر آبادی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے جس کے سبب مقالہ کا بیشتر حصہ ان کی منظومات ہی کے مطالعہ پر مشتمل ہے اس لئے اصل موضوع پر گفتگو سے قبل نظم کے آغاز وارتقاء سے متعلق ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ اس میں ''نظم کا آغاز وارتقا۔ سیماب کے عہد تک'' عنوان کے تحت بہت مختصر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کا دوسرا باب سیماب کے نظمیہ مجموعوں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس میں سیماب کی نظموں کے مجموعوں ''نے ستاں''، ''کارِ امروز''، ''ساز و آہنگ'' اور ''شعرِ انقلاب'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب سیماب کی غزل گوئی کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے ''کلیم عجم''، ''سدرۃ المنتہیٰ'' اور ''لوحِ محفوظ'' ہیں۔ ''کلیم عجم'' دراصل ان کے چودہ خطبات شاعری کا مجموعہ ہے۔ اسی کے ساتھ اور اسی عنوان سے سیماب نے تین حصوں

پر مشتمل پہلا مجموعۂ غزلیات بھی شامل کر دیا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب رباعیات سیماب سے متعلق ہے جس میں انھوں نے عصری پیچیدگیوں، ناہمواریوں اور پریشانیوں کو بیان کیا ہے نیز بڑی قوموں کے جبر واستبداد اور ان کے ذریعہ دنیا پر دوسری عالمی جنگ تھوپنے اور کمزور وغریب اور محکوم قوموں کو اس کا سنگین خمیازہ بھگتنے جیسے موضوعات پر رباعیاں لکھ کر ان پر سخت طنز کیا ہے۔ اسی پس منظر میں تاریخی و سیاسی حوالے بھی جگہ جگہ موجود ہو گئے ہیں۔

مقالے کے پانچویں باب میں سیماب کی عزائی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نظم جدید کے آغاز کے بعد جدید تقاضوں کے تحت اردو کی جن دوسری شعری اصناف میں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں ان میں مراثی اور سلام بھی شامل تھے۔ سیماب نے مرثیوں اور سلاموں کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ان کے موضوعات واسالیب میں بھی تنوع پیدا کیا اور اپنی شاعرانہ مہارت اور فنی پختگی کا ثبوت دیتے ہوئے عزائی شاعری پر مشتمل دو مجموعے ''سرودِ غم'' اور ''نفیر غم'' ۱۹۴۳ء میں شائع کئے۔

مقالے کا چھٹا باب سیماب کے منظوم تراجم بہ عنوان ''وحی منظوم'' اور ''الہامِ منظوم'' پر مشتمل ہے۔ اول الذکر میں سیماب نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور ہر آیت کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ جس سے واضح طور پر ان کی عربی دانی اور قرآن پاک سے شغف کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ دوسرا ترجمہ ''الہامِ منظوم'' ہے جس کے تحت انھوں نے ''مثنوی معنوی'' یعنی مولانا روم کی مثنوی کے چھ دفتروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ شعری کارنامہ بھی ان کی زبردست شاعرانہ عظمت اور کلاسیکی فارسی ادب پر گہری نظر اور فارسی زبان سے مہارت کا گہرا ثبوت ہے۔

مقالے کا ساتواں باب ''سیماب کی زبان اور طرزِ ادا'' سے متعلق ہے۔ سیماب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور ان کے پاس ذخیرۂ الفاظ بھی غیر معمولی تھا۔ زبان کے حسب دل خواہ استعمال پر انھیں بھرپور عبور تھا۔ زبان کی سادگی و پرکاری، نغمگی و موسیقی اور محاسنِ شعری کے استعمال پر انھیں کمال حاصل تھا۔ اپنی شاعری میں انھوں نے ان تمام رموز و نکات کو پیش نظر رکھا ہے جو ان اصناف سے متعلق شعری آداب کا تقاضا ہوتے ہیں۔

اس طرح اپنے موضوع سے متعلق سات ابواب پر مشتمل یہ مقالہ مکمل کر کے شعبہ اردو میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ اس کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کرتی ہوں کہ محض ان کی مہربانیوں سے یہ کام انجام کو پہنچا۔ میں اپنے مشفق ترین استاد و نگراں پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ہاشم صاحب کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے تحقیقی کام کے سلسلے میں قدم قدم پر میری رہنمائی اور ہمت افزائی فرمائی۔ راتوں کو دو دو بجے تک جاگ کر اور جاڑوں کی راتوں میں شعبے میں گیارہ گیارہ بجے تک بیٹھ کر ابواب کو پڑھتے اور اصلاح دیتے، صبح کو انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ مجھے سمجھاتے۔ تحقیقی کام کے دوران میرے والدین کے انتقال کے بعد ہر وقت دل سوزی، دردمندی اور حوصلہ افزائی فرماتے، علمی و عملی طور پر میرے ساتھ ہر طرح کے تعاون کے علاوہ میرے فیلوشپ کی بحالی کے لئے جس قدر جتن انھوں نے کئے ہیں، اللہ پاک ہی اس کا اجر انھیں دے سکتے ہیں۔ کاش ایسے شفقت و مرحمت والے استاد سبھی اسکالرز کو نصیب ہوں۔ اگر ان کی خصوصی توجہ میرے شامل حال نہ ہوتی تو میرا مقالہ ہرگز موجودہ صورت میں نہیں آسکتا تھا۔ مقالے کی تکمیل کے علاوہ میرے علمی ذوق و شوق کو پروان چڑھانے میں استاد محترم کی شخصیت، مزاج اور علمیت کا بہت بڑا دخل ہے۔ میں ان کی صحت و سلامتی کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں۔

اس کے علاوہ پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد امین، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر سراج اجملی اور دیگر اساتذہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے گاہِ بہ گاہِ میری حوصلہ افزائی کی۔ جناب افتخار امام صدیقی، مدیر ''شاعر'' کی میں بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے ممکنہ ذرائع سے مواد کی فراہمی میں میری مدد فرمائی۔

میں اپنے مقالے کے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے سلسلے میں اپنے پیارے مرحوم ابا جی اور امی جان کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ وہ دونوں، ہر وقت میری تحقیق کی تکمیل اور میرے مستقبل کے لئے فکرمند رہتے اور دعا کرتے رہتے تھے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ میری اس کاوش اور اس کے نتیجے کو اپنی محبت بھری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے اور وہ دوران تحقیق ہی مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ جب کہ انھوں نے پالا، پرورش کیا اور میرے ہاتھوں میں قلم دے کر سب کچھ دے دیا۔ اور دوری، درد اور کرب برداشت کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا (اے میرے پالنے والے! جس طرح ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے میرے ساتھ مہربانی اور نوازش کا معاملہ کیا ہے، اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما (آمین)۔

اس موقع پر میں اپنی پیاری باجی گل رعنا علیگ نیز اپنے بھائی اعجاز عالم علیگ اور عزیزی اقبال قاسم علیگ، انجینئر کی احسان مند اور شکر گزار ہوں جن کی محبت، ایثار و قربانی اور بے انتہا زحمتوں نے والدین کی جدائی کے سبب مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خدا ان کو سلامت اور ہمیشہ کامیاب و کامران اور خوش و خرم رکھے (آمین)۔

اس موقع پر میں ڈاکٹر حسن کی عنایتوں پر احسان مندی کا اظہار کرنا ضروری سمجھتی ہوں جنھوں نے میری زندگی کو ہمہ وقت مثبت راہ دکھائی۔ محترم شہاب الدین بھائی، رفیع الدین بھائی، رضا بھائی، خالد بھائی، فاطمہ آپا، کمال بھائی، لئیق بھائی اور آفتاب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے مشکل اوقات میں مدد و رہنمائی کی۔ میں ہاسٹل کے دوستوں میں عذرا بانو، افسانہ، عائشہ، نشاط اور حنا کوثر کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میرے ساتھ تعاون کیا۔

مولانا آزاد لائبریری کے اراکین میں محسن بھائی، باقر بھائی، جاوید بھائی، رامش بھائی، شعبۂ اردو کی سمینار لائبریری کے سہیل بھائی، ندیم بھائی اور شعبہ کے دفتر کے سبھی اراکین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی اور میرے تمام علمی اور دفتری کاموں میں دلچسپی لی اور حتی الامکان میری مدد کی۔ کمپوزنگ کے لئے میں طیب بھائی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

Farhat Zehra

فرحت زہرا

اردو ادب اپنی دو بنیادی قسموں نثر اور نظم سے مرکب ہے۔ نثر وہ پیرایۂ اظہار ہے جس میں خیالات کو مربوط، منضبط اور مسلسل انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ مضمون، سوانح، خاکہ اور رپورتاژ وغیرہ نثر ہی کی مختلف اصناف ہیں۔ نثر کے مقابلے میں لفظ نظم کا استعمال شاعری اور تمام شعری اصناف کے لئے کیا جاتا ہے، جن میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، نظم، واسوخت، ریختی وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ نظم اور نثر کے مجموعہ کا نام ادب میں ہے لیکن یہی لفظ ''نظم'' جب ایک جداگانہ اور تخلیقی طور پر ایک اصطلاح کے طور پر بولا جاتا ہے جسے ''نظم'' کہتے ہیں تو اس سے ایک مستقل موضوع پر لکھے ہوئے مسلسل اشعار مراد ہوتے ہیں۔ اور اس قدیم سلسلے کا نقطۂ عروج نظیرؔ اکبرآبادی ہیں جنھوں نے سیکڑوں نظمیں لکھی ہیں اور اس کے بعد صنعتی انقلاب کے نتیجے میں نئے حالات اور نئے تقاضوں کے تحت اردو میں باقاعدہ تحریک کے طور پر مولانا آزاد اور مولانا حالی کے ذریعہ ۱۸۷۴ء میں اس صنف کی تجدید ہوئی۔ کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں منعقد ہونے والے مشاعروں/مناظموں نے اسے ایک کامیاب اور باوقار صنف کی شکل عطا کی۔ یوں تو اس صنف کی داغ بیل امیر خسرو کے زمانے میں پڑ چکی تھی اور یہ سلسلہ دیگر دکنی صوفیائے کرام جن میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں، کے ساتھ ساتھ گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، ابن نشاطی، علی عادل شاہ، نصرتی، عواضی وغیرہ سے ہوتا ہوا ولیؔ تک پہنچتا ہے جو شمال اور دکن کے سنگم کی حیثیت سے نمایاں ہوکر سامنے آتے ہیں۔ اس سبھی شعراء نے اپنی اپنی پسند کی مروجہ شعری اصناف کے علاوہ نظم میں بھی طبع

آزمائی کی اور اپنا مقام حاصل کیا۔

محمد قلی قطب شاہ کی نظمیہ کاوشوں کا اردو نظم کے ارتقاء میں اہم مقام ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے بہت کامیاب اور عمدہ نظمیں بھی لکھی ہیں جن کے موضوعات و اسالیب متنوع ہیں۔ انھوں نے عہد حاضر کے شعراء کی طرح الگ الگ موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جن کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنی نظموں میں فکری و فنی دونوں اعتبار سے ہندوستانی تہذیب کو نئے نئے انداز میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت وقدرت رکھتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر سعیدہ جعفر نے لکھا ہے کہ:

> ''محمد قلی وہ پہلا شاعر ہے جس نے تنگنائے غزل سے نکل کر بیان کی دیگر وسعتوں کو تلاش کیا۔'' [۱]

حقیقت یہ ہے کہ ان کی آزاد روی اور جدت پسند طبیعت نے ان کی شاعری کو گوناگوں موضوعات سے مالا مال کیا۔ انھوں نے شاعری میں اپنے زمانے کے مختلف کھیلوں، تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور محلات کی تہذیب کو عمدہ و فنکارانہ طریقے سے نظم کیا ہے۔ تصنع، تکلف اور ملمع کاری قلی کے یہاں کم سے کم تر ہے۔ ان کی شاعری، بے لاگ حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کی مظہر ہے۔

ان کی شاعری میں شاہی لوازم، درباری تکلفات، باغات کی سرسبزی وشادابی کے ساتھ عوام کے خیالات اور جذبات وعقائد اور سماج کے عام رسم ورواج کی عکاسی بہت خوبی سے ملتی ہے۔ اسی لئے مولوی عبدالحق نے قلی قطب شاہ کی نظموں کے موضوعات کی وسعت و

۱۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، مارچ ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۸

تنوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''محمد قلی نے اپنے دور کے مختلف رسم و رواج، برسات اور دیگر موضوعات جیسے ہولی، پان اور بسنت اور پانے ہاتھی پر نظمیں لکھی ہیں اس کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے تنگ کوچے سے باہر نکل کر قدرت کی خوبیوں کی داد دے سکتا ہے۔'' [۱]

قلی کے یہاں جمالیاتی ذوق اور رومانی شعور نے مناظرِ قدرت و مظاہرِ فطرت کی بہت عمدہ و دلکش تصویریں پیش کی ہیں۔ محمد قلی حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کی بھی اپنی ترجیحات رکھتے ہیں۔ تبدیلی، تصنع، تکلف اور ملمع کاری ان کے یہاں کم سے کم تر ہے۔ ان کے کلام میں سادگی و پرکاری دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

قلی قطب شاہ کے معاصر شعراء کے یہاں بھی مختلف موضوعاتی نظمیں ملتی ہیں اور بعد ادوار میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعرا میں ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی، میراں جی، بحری، رستمی، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، ہاشمی، نصرتی، سیوا، لطیف وغیرہ نے نظم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان شعرا کے یہاں مذہبی و مسلکی جذبات کی عکاسی کے علاوہ مختلف تقریبات کا بیان اور موسموں کا ذکر خاصی تفصیل سے ملتا ہے۔ غرض اردو نظم کے آغاز و ارتقاء میں ابتداء سے ہی دکنی شعرا کا اہم کردار رہا ہے۔ دکن کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں شمالی ہند میں بھی نظم نگاری کے لئے فضا تیار ہو رہی تھی۔ اس دور کے شعرا نے مثنویات، مخمسات اور عزائیہ نظمیں اور سلام وغیرہ لکھ کر اردو نظم کے امکانات کو وسیع کیا۔ اس سلسلے میں مضمون،

۱۔ مضمون کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ، مولوی عبدالحق مشمولہ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۲۲ء، ص ۱۵

ناجی، فائز، آبرو، یکرنگ، خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

دکن و شمال کے سنگم عظیم اردو شاعر ولی کا اردو شعر و نظم کو شمالی ہند پہنچانے اور اسے مقبول بنانے کا کارنامہ نا قابلِ فراموش ہے۔ ولی کے بعد اردو کے بعد عظیم شعرا کے یہاں نظم گوئی کے نمونے جستہ جستہ مل جاتے ہیں۔ میر و سودا کی بعض قدیم اور غیر متداول شعری اصناف میں نظم کے امکانات کافی نظر آتے ہیں۔ لیکن انھیں اس صنف میں با قاعدہ شہرت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

البتہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں نظم کو با قاعدہ صنف کے طور پر اختیار کیا گیا اور جس شخص نے از اول تا آخر اس صنف کی آبیاری کی اس کا نام نظیر اکبر آبادی ہے۔ انھوں نے صنف نظم کو زندگی کی حرارت بخشی اور اسے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ نظیر کو ایک زمانہ تک عوامی شاعر سمجھا گیا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں معاشرے میں پھیلی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا کھل کر بیان کیا۔ وہ ایک آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے شاعری کو زندگی کا حقیقی ترجمان سمجھا۔ نظیر نے زبان و بیان اور شاعری کے قواعد و ضوابط کو بہت با قاعدگی سے برتا۔ انھیں زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے نظیر کی شاعرانہ اہمیت و عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے:

> ''اس دور میں خالص نظم کے ضمن میں اہم ترین نام نظیر اکبر آبادی کا ہے.....اس کی اصل عطا خالص نظم کا وہ حصہ ہے جس میں اس نے اپنی دھرتی سے گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے.....وہ ایک تماشائی نہیں بلکہ شریک کار ہے اور کسی اونچے ٹیلے

پر.....نہیں بلکہ ناچتے تھرکتے ہوئے انبوہ کا جزو ہے۔نظیر کی
نظم کو اس سے فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی۔ فائدہ اس طرح کہ
اس نے نظم کے تحلیلی اور تجرباتی عمل کو اپنا کر زمین کی سطح پر پیش
قدمی کی اور یوں اس کے یہاں اکتساب کے بجائے تجربے کا
عمل واضح ہوا۔ نقصان اس طرح کہ اس تجربے کی حیثیت
انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔'' ۱؎

نظیر اکبرآبادی کی حیثیت محض شاعر کی نہیں بلکہ ایک مفکر اور مصلح کی سی ہے۔انھوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور انسان کو کامیاب زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔ان کی شاعری محض گل وبلبل کی شاعری نہیں بلکہ انسانی زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں ہر انسان اپنے خدوخال بآسانی تلاش کرسکتا ہے۔نظیر اکبرآبادی نے صرف عشق ومحبت کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ کائنات کی تلخ حقیقتوں سے عام انسانوں کو روشناس کرایا۔ان کی شاعری ان کے مزاج کی پوری طرح سے ترجمانی کرتی ہے۔

نظیر نے انتہائی خلوص وجرات اظہار سے اردو نظم کو ایک اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ان کی نظموں میں جگہ جگہ انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کی تصویر کشی ملتی ہے۔ حالانکہ نظیر اکبر آبادی سے پہلے اور بعد میں بھی اردو شعراء نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔لیکن نظیر نے خاص توجہ عوامی مسائل اور ان کی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ:

۱۔ اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ص ۳۹۲

''نظیر نے ہر جگہ عوامی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ایسے عوامی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جس سے عوامی زندگی عبارت ہے ان کی خوشیاں ان کے رنج وغم ان کے جذبات ان پر بیتی کیفیات، ان کے تیوہار ونظریات، اعتقادات وتوہمات، سب کے سب نظیر کی شاعری میں بے نقاب ملتے ہیں۔ نظیر اس اعتبار سے بہت بڑا شاعر ہے۔'' [۱]

نظیر کی شاعری میں عوام وخواص کا پہلو ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ خواہ ان میں میلوں ٹھیلوں کا ذکر ہو، موسموں اور تہواروں کا بیان ہو اسی طرح امیر وغریب کا فرق نظیر کے لئے تکلیف دہ اور ایذا رساں ہے۔

نظیر کی شاعری میں مقامی رنگ کے تحت وہ نظمیں آتی ہیں جس میں انھوں نے مختلف تہواروں، تقریبوں اور میلوں ٹھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ہولی، دیوالی، راکھی، جنم کنھیا جی، بلدیو کا میلا، درگا جی کے درشن، آدمی نامہ، تیراکی کا میلا، عرس حضرت سلیم چشتی وغیرہ کے ساتھ عید اور شب برات، روٹی وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ نظیر کی یہ نظمیں مقامی خصوصیات سے مملو ہیں۔ ان کا یہی کمال فن ان کی نظموں کو بلندی عطا کرتا ہے۔ وحید الدین سلیم نے بھی نظیر کی عوام پسندی کو سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نظیر اکبرآبادی نے عام لوگوں کے میلوں ٹھیلوں اور ان کے حالات و خیالات اور مشاغل زندگی کی ایسی سچی اور واضح

۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادب لطیف، جون ۱۹۴۹ء، ص ۲۰

تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس کا مقابلہ اس بات میں نہیں
کرسکتا۔'' ۱

مشہور مستشرق ڈاکٹر دبلیو ایس فیلو نے اپنی نئی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری کے دیباچہ میں نظیر کی شاعرانہ خصوصیات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی رجائیت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''نظیر کو فطرت کے ہر منظر اور انسانیت کے ہر رخ سے محبت تھی۔
وہ ہر چیز میں خیر کا پہلو دیکھتا تھا۔ وہ عوام کے ساتھ ہنستا تھا، قہقہے
لگاتا اور ٹھٹھے مارتا ہے وہ ان کے درد کو محسوس کرتا ہے۔'' ۲

نظیر نے غزلیں بھی لکھی اور نظمیں بھی اگرچہ ان کی غزلیں بھی انفرادی شان رکھتی ہیں مگر نظموں نے نظیر کو بے نظیر بنا دیا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں کہ شاعری کی عظیم روایت کے ساتھ نظیر اکبرآبادی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' ۳

کلیم الدین احمد نظیر کی شاعری کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نظیر حقیقت طراز ہیں۔ جو چیزیں وہ گردوپیش میں دیکھتے ہیں
ان کی جیتی جاگتی تصویریں اتارتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں
خاص ہندوستان کی فضا میں سانس لیتی ہیں۔'' ۴

۱۔ اردو شاعری کا مطالعہ، وحیدالدین سلیم، رسالہ اردو، جنوری ۱۹۴۳ء، ص ۱۸۸

۲۔ Dr. W.S. Fallow, New Hindustani English Dictionary
Medical Hall, Press, Banaras, 1979 A.D

۳۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، احتشام حسین، ص ۱۱۷

۴۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۳۹

نظیر کے بعد ایک متشکل موضوع پر مسلسل اشعار لکھے جاتے رہے۔ ''ساقی نامہ'' قطع بند اشعار اور بعض دوسری نظم نما چیزیں جستہ جستہ وجود میں آتی رہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد سے قبل تک اس صنف میں سناٹا نظر آتا ہے۔ اور اس جاندار اور شاندار صنف کو باقاعدہ تحریک کے طور پر اختیار کرنے کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے نئے حالات اور ماحول میں شاعری کو مقصدی، افادی اور حقیقت پسندی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا۔ ہمارے مشاعروں کی ادبی روایت کے تحت طویل عرصہ سے مصرعہ طرح دے کر اس پر غزلیں کہنے کا رواج تھا۔ مولانا آزاد نے ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے تحت ہونے والے مشاعروں نے اس روایت کو توڑا اور موضوعات دے کر ان پر نظمیں لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ یہیں سے آزاد نے نظم اور کلام موزوں کے بارے میں اپنے خیالات بھی پیش کئے اور اس کے بعد لاہور کے شاعروں اور مناظموں میں موضوع دے کر نظم لکھوانے کا رواج عام ہوگیا۔ اس مشاعرے کی روایت بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کے خیال میں محمد حسین آزاد نے پہلی نئی نظم ۱۸۶۴ء میں لکھی۔[۱] آزاد مرحوم اپنی نظم کے لئے بحر کے انتخاب میں فرد تھے۔ ان کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ سست بحروں میں کبھی قلم نہیں اٹھاتے تھے۔ قوت تالیف اور حسن ادا جدت تخلیق اور اسلوب ان کی ندرت پر ختم ہے۔[۲]

مولانا آزاد نے اپنی معلومات واستعداد کے مطابق انگریزی ادب وشاعری کا عمیق

۱۔ سوغات، خلیل الرحمٰن اعظمی، جدید نظم نمبر، ص ۸۶

۱۔ منشورات، پنڈت دتاتریہ کیفی، ص ۱۲۹

نظر سے مطالعہ کیا اور ان خیالات سے اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا۔ مولانا حالؔی، مولانا آزادؔ کے افکار و خیالات اور اس نئی تحریک مناظمہ کے سب سے مضبوط حامی و محرک بنے اور ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے نئے خیالات اور انقلاب آفریں خیالات اور فکری و فنی پیش کش میں آزادؔ کے قدم سے قدم ملا کر چلے اور اس طرح اردو میں نظم جدید کے بانین میں ان کا شمار ہوا۔

حالؔی اور آزادؔ نے جس نظم جدید کی بنیاد ڈالی اس تحریک سے شاعری کو نیا رنگ و آہنگ ملا۔ نئی اردو نظم کے لئے فضا ہموار ہوئی۔ نظم میں ان دونوں حضرات کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ انگریزی ادب کے غیر معمولی اثرات اردو ادب پر مرتب ہوئے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اس نئی تحریک کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس کے خشت و سنگ میں درج ذیل عناصر کی نشاندہی کی ہے:

> ''غدر کے بعد اردو شاعری نے جو جنم لیا ہے اردو نظم نگاری کی جو تحریک پھیلی ہے اس میں کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر نظیر کا اثر برابر کام کرتا ہے۔ حالؔی اور آزادؔ جو جدید نظم اردو کے دو زبردست معمار ہیں نظیر سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اسماعیل میرٹھی کے ہاں تو یہ اثر اور بھی واضح اور نمایاں ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہماری زبان میں اگر ریچھ کا بچہ، کورا برتن، تندرستی نامہ، اوس، موسم زمستان، برسات، رحم و انصاف کا جھگڑا، اسلم کی بلی، ذال اور حالی اسماعیل کی اسی قسم کی نظمیں ابھی نہ جانے کتنی دیر بعد ہم کو ملتیں اور ان کے راستے میں نہ جانے کیا کیا

دقتیں ہوتیں۔ اس کو مانتے ہوئے ہماری طبیعت ہچکچاتی ہے اس لئے کہ حالؔی سے لے کر اس وقت تک اردو کے نظم نگاروں کا اسلوب عموماً نظیر کی یاد نہیں دلاتا نظم میں ایسی فضیلت شاہی کا رواج چلا جو غزل اور قصیدہ میں چلتا رہا۔ اور غیر ملکی عناصر ہماری شاعری میں کم و بیش اسی طرح غالب رہے۔ لیکن حالؔی کی برکھا رت، مناجات بیوہ، شکوہ، ہند اور اسمائیل میرٹھی کی اکثر نظموں میں نظیر کا کافی رنگ ہے۔ جو ان شاعروں کے اپنے اپنے انفرادی رنگ کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔'' [۱]

مولانا آزاد نے ان نظموں کے موضوعات اور بیان کی نیرنگیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے لطیف پیرایے میں یوں گل افشانی کی:

''نظم درحقیقت ایک شاخِ گلریز فصاحت کی ہے۔ جس طرح پھولوں کے رنگ جلو سے مختلف خوشبوئیں محسوس دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہوتی ہے کسی کی بو مست، کسی کی بو میں نفاست و لطافت ہوتی ہے، کسی میں سہانا پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے۔ جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں کبھی ہار میں کبھی عطر، کبھی عرق میں جا کر کبھی دور سے کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔'' [۲]

۱۔ ادب اور زندگی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ص ۲۹۹۔۳۰۰

۲۔ نظم آزاد، مولانا محمد حسین، ص ۶۔۷

آزاد نے اردو شاعری میں فارسی لفظیات کی پیروی کے بجائے مقامی لفظیات و تلمیحات کے استعمال کی تحریک بھی چلائی جس کا اردو کے شعری ماحول پر بہت گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے جدید نظم کے بارے میں اپنے خیالات نثر کے علاوہ نظموں میں بھی پیش کئے ہیں۔ متعدد نظموں میں انھوں نے اپنے شعری اصولوں اور اس نئی تحریک کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے اور ایسی تمام نظمیں اردو تاریخ میں ایک خاص مقام اور سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے آزاد کو جدید اردو نظم کا موجد قرار دیتے ہوئے بہت خوبصورت مثالوں کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''اگر امیر خسرو نے اردو کا پہلا شعر موزوں کیا، اگر ولی نے پہلا دیوان اردو نظم کا مرتب کیا، اگر بے خود یاور نے پہلا دوہا ہندی زبانوں میں باندھا، اگر رودکی نے پہلا شعر فارسی کا کہا تو حضرت آزاد نے پہلی نظم نئی طرز کی موزوں فرمائی۔'' [۱]

پروفیسر احتشام حسین بھی کیفی کی اس رائے سے متفق نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

> ''آزاد کو نظم گوئی اور نئے تصورات کے پھیلانے میں جو اولیت حاصل ہے اس کا تسلیم کرنا صحیح تاریخی نقطۂ نظر قائم کرنے کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ اسی طرح ہم ان مناظموں تک پہنچ سکتے ہیں جنھوں نے منازلوں کی جگہ لے لی ہے اور اس جدید شاعرانہ تحریک کو ساز و برگ عطا کئے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔'' [۲]

۱۔ منشورات، پنڈت دتاتریہ کیفی، ص ۱۲۹

۲۔ اردو نظم کا تاریخی و فنی ارتقاء عکس اور آئینہ، احتشام حسین، ص ۵۲

آزاد کی ایک اور سوانح نگار اور نقاد نور جہاں بانو بیگم نے بھی پنڈت کیفی کی طرح نظم میں آزاد کی اولیت وافضلیت کو ایک نئی تشبیہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''آزاد کا رتبہ اردو شاعری میں وہی ہے جو اسکاٹ کا انگریزی شاعری میں۔ کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نظر سے دیکھ سکتی ہے آزاد بھی اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ قدیم شاعری کی اصلاح کا انھوں نے ہی سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور جدید شاعری کا تخم بویا۔ دنیائے ادب انھیں کی بدولت نیچرل شاعری کے اصل مفہوم سے آشنا ہوئی۔''[۱]

یہ مسلمہ حقیقت آزاد کی نظمیں ان کے زمانے میں نیچرل شاعری کے نام سے یاد کی جاتی تھی اور اسی لئے انجمن پنجاب کی شعری تحریک کو بھی نیچرل شاعری کی تحریک کے نام سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی فطرت نگاری میں مضبوطی ومہارت کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''ایک چیز جو آزاد کے کلام میں خاص طور پر نمایاں ہے وہ یہ کہ آزاد کا شعری مطمح نظر ہمیشہ ایک رہا ہے۔ ان کے خیالات میں حالی، شبلی وغیرہ کی طرح کبھی تذبذب پیدا نہیں ہوا۔ ان کی شاعری فطرت پرستی حقائق کی تلاش اور حیات انسانی کے حسین اور شگفتہ پہلوؤں کی خاکہ کشی کی ایک مسلسل کوشش نظر آتی ہے۔

۱۔ محمد حسین آزاد کے حالات زندگی اور تصانیف وکلام پر تبصرہ، جہاں بانو بیگم، ص ۱۵۴

آزاد کے ذہن میں شعر کا معیار تھا اس کو انھوں نے اپنی ایک
تقریر میں تفصیل سے ظاہر کیا ہے۔'' [۱]

ایک اور زاویے سے غور کریں تو آزاد کی فنی افضلیت مزید ظاہر ہوتی ہے۔ میر حسن اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ کے بعد آزاد اردو کے بڑے منظر نگار شاعر تھے ان کی شاعری فطرت پرستی، حق پسندی اور حیات انسانی کی تفسیر کہی جاسکتی ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال نہایت حسین انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں منظر نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی عکاسی میں آزاد نے نہایت لطیف اور خوبصورت پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔ الفاظ ان کے سامنے موم ہو جاتے ہیں۔ زبان پر مہارت اور بیان پر قدرت ان کی تمثیلی اور تاریخی نثر کی طرح ان کی نظموں میں بھی اپنا لوہا منواتی ہے۔ ان کی متعدد نظمیں ان کی منظر نگاری کے بہترین نمونے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مثنوی ''ابر کرم'' میں انھوں نے ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں پیش کیا ہے اور یہ نظم انھوں نے حالی کی ''برکھارت'' کے طرز پر لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے ہیں
وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے جھلک رہے
آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور رولے سبز زار کا دھو کر سنوارنا

۱۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص ۱۰۸

گرنا وہ آبشاروں کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

''شب قدر''، ''صبح امید'' اور ''خواب امن'' وغیرہ بھی آزاد کی اچھی مثنویاں ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں ''گنج قناعت''، ''داغ انصاف''، ''داد انصاف'' وغیرہ میں بھی اسی قسم کے خوبصورت استعاروں سے کام لیا ہے جو ان کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ عرض کیا گیا انھوں نے انگریزی نظموں سے خیالات اخذ کر کے متعدد اردو نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً محنت کرو، ایک تارلے کا عاشق وغیرہ۔ غرض مولانا آزاد جس طرح تمثیل نگاری میں طاق اور تاریخ ادب اردو کے پہلے مرتب و نقاد ہیں اسی طرح جدید نظم نگاری کے آغاز و ارتقاء اور اس کو صحیح رخ دینے اور بلند معیار عطا کرنے میں بھی اولیت و افضلیت کے حامل ہیں۔

نظم نگاری کی جس نئی تحریک کا آغاز آزاد نے کیا تھا حالؔی نے اس تحریک کو مزید آگے بڑھایا اور دونوں نے مل کر اس تحریک کے موضوعاتی مشاعروں میں شرکت کی اور اپنی اپنی نظمیں پیش کیں۔ حالی نے برکھارت، امید، رحم و انصاف، حب وطن اور بیوہ کے ذریعہ اپنے نظریات اور تصورات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کی نظموں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ان نظموں میں مغرب کا گہرا اور براہِ راست اثر نہیں ہے لیکن بالواسطہ طور پر یہ مغرب کے زیر اثر ضرور لکھی گئی ہیں اور ان میں موضوع اور انداز بیان دونوں اعتبار سے ہم آہنگی نظر آتی ہے۔''[۱]

۱۔ منظومات حالی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۴۰۸

۱۸۷۴ء میں حالؔی نے محمد حسین آزاد کے ساتھ قدیم شاعری کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور نیچرل شاعری کو منظر عام پر لانے کے لئے دونوں نے سرگرم حصہ لیا جس کے نتیجے میں لکھنؤ میں بھی جدید طرز کی انجمن قائم ہوگئی تھی۔ گارساں دتاسؔی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''نئے قسم کے مشاعروں کی ایک انجمن منظرِ علی اثر کی نگرانی میں قائم ہوئی پہلا مشاعرہ ۱۱ر ستمبر ۱۸۷۴ء کو قائم ہوا جس میں نئے انداز کی غزلیں پڑھی گئی۔'' [۱]

حالی نے قوم کو بیدار کرنے کے لئے نظم نگاری کی شروعات کی تھی۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اس لئے انھیں اس بات کا یقین تھا کہ نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ پُر اثر ثابت ہوسکتی ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ابتداء سے ہی قوم کی ترقی وتعمیر میں شاعری کا نہایت اہم حصہ رہا ہے۔

حالی کی شاعری کا آغاز قدیم رنگ میں ہوا۔ ان کی شاعری کا میدان وسیع ہے انھوں نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مسدس، ترکیب بند جیسی روایتی اصناف اور ہیئتوں میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں اپنا الگ رنگ بھی نکالا۔ ۱۸۷۴ء میں انھوں نے لاہور کے نظمیہ مشاعروں کے لئے جدید نظمیں لکھیں اور نیچرل شاعری کی طرف اپنی توجہ خاص طور سے مبذول کی۔ ان کی شاعری کی ہمہ جہتی، سادگی، تاثیر اور دلکشی کے اسباب پر غور کرنے میں پروفیسر حامدی کاشمیری کا درج ذیل اقتباس ہماری بہت مدد کرتا ہے:

''حالی کے کلام میں معرفت وتصوف کی چاشنی موجود ہے۔ وہ

۱۔ مقالات گارساں دتاسی، گارساں دتاسی، ۱۸۷۴ء، ص ۳۶

ایک رند مشاہد باز کے بجائے صوفی پاکباز تھے ان کے تصوف میں فلسفہ کی موشگافیاں نہیں ہیں۔ سچائی خلوص محبت اور عقیدت ہے۔ ریاکاری اور ظاہر داری سے انھیں نفرت ہے اور نام نہاد صوفیوں کے یہاں زبان تراشی کا عمل دخل تھ۔ ..... ہمہ اوست، ہمہ از اوست، جبر و قدر، تزکیہ نفس وغیرہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔'' ۱

حالی کی نظم نگاری کی خصوصیات کے پس منظر کے طور پر اختر اورینوی کا یہ خیال بہت اہمیت رکھتا ہے:

''نظم میں خیالات اور تجربوں کا صرف سپاٹ اظہار نہ ہو بلکہ شاعرانہ پر کیف اظہار ہو ایک نظم ایک مکمل اکائی ہوتی ہے۔ اس کا ایک مرکزی موضوع ہونا چاہئے اور اس مرکزی موضوع کے گرد دوسری ذیلی تفصیلات ہم آہنگ طور پر پیش ہوسکتی ہیں۔ نظم کی مکمل اور متعین عضویاتی تنظیم کے حصول کے لئے یہ لازمی ہے کہ کہیں جھول نہ ہو کہیں رخنہ نہ ہو بیجا اضافہ نہ ہو اور تکرار بھی عجیب ہے اور نا مناسب کمی اختصار اور تشنگی بھی نظم کی تعمیر و تشکیل میں حائل ہوتی ہے۔'' ۲

اور یہ حقیقت ہے کہ حالی کی نظم نگاری مذکورہ بالا اصول کی پابند ہے۔ ان کی نظموں

۱۔ جدید اردو نظم یوروپی اثرات، حامدی کاشمیری، ص ۲۵۵

۱۔ قدر و نظر، اختر اورینوی، ص ۱۶۵۔۱۶۶

میں فن کا مکمل نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ مولوی نذیر احمد اپنے متعدد لکچروں میں ان کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''مولوی الطاف حسین حالی نے نظم کا رنگ بدل دیا ہے اور شاعری اگلی گندگی اور بیہودگی سے بہت کچھ پاک ہوگئی ہے۔''[۱]

حالی کی نظمیں اردو شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے شاعری کی ایک نئی راہ ہموار کی اور اس کو نئی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ''برکھا رت'' حالی کی پہلی نظم ہے۔ اس نظم کو انھوں نے انجمن پنجاب کے مشاعرے میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے۔

یہ نظم ان کی تصویر کشی کا اچھا نمونہ ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا　　اک شور ہے آسماں پر برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے　　اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے　　گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھائی　　اک آتی ہے فوج ایک جاتی

بلاشبہ حالؔی نے اس میں وہ تمام خوبیاں پیش کردی ہیں جو ایک اعلیٰ پائے کی نظم میں ہونی چاہئیں۔ اس نظم میں ان کا انداز پوری طرح جذباتی معلوم ہوتا ہے۔ حالؔی نے مختصر، طویل اور طویل تر غرض ہر طرح کی نظمیں لکھی ہیں اور ان میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مسدس حالی، مناجات بیوہ اور چپ کی داد وغیرہ نظموں کے موضوعات متنوع ہونے کے باوجود حالؔی کی انفرادیت اور ان کے مخصوص انداز پر صادق ہیں۔ اسلوب احمد

۱۔ مجموعہ لیکچرز، نذیر احمد، جلد دوم، ص ۷۶

انصاری نے اپنے مضمون ''حالی ادبی مجدد کی حیثیت سے'' میں ان نظموں کے بارے میں لکھا ہے۔ ''یہ نظمیں جدید اردو شاعری کے خدوخال کو تدحین کرتی ہیں۔ یہ نظمیں نیچرل شاعری کے ضمن میں آتی ہیں کیونکہ ان میں منظر نگاری بھی ہے اور عام انسانی جذبات اور معاملات کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں ہندوستانی زندگی اور معاشرت کی بو باس بھی ہے۔''[۱] ڈاکٹر محمد حسن نے ان نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ادبی اعتبار سے ان نظموں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ انھوں نے شاعری کی غیر ضروری حد بندیاں توڑ دی اور اسے ہر قسم کے افکار و مسائل، جذبات و احساسات کی آماجگاہ بنایا۔ اب شاعری عشق کی سرگوشی نہیں تھی۔ علم و ادراک کے سارے شعبوں کی آواز تھی۔ اور اسی آواز کو سوز و گداز جذبے کے خلوص اور شخصیت کی آگ میں تپا کر جمالیاتی رنگ و روغن بخشا گیا تھا۔ انداز بیان کے اعتبار سے نیچرل شاعری کے تقاضوں کے پیش نظر حالؔی نے شاعری کا حسن تشبیہ و استعارے تلمیح یا خیال بندی کے جوہر کے بغیر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا فن بیرونی آراستگی اور آرائش در و بام کا فن نہیں ہے بلکہ اندرونی تب و تاب کا فن ہے جو خیال کے جمال اور فکر کی آنچ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ صقیل کے قائل نہیں بلکہ اس سادہ حسن کے قائل ہیں جو غازہ اور زیور سے کم و بیش بے نیاز ہو۔''[۲]

۱۔ حالی ادبی مجدد کی حیثیت سے، اسلوب احمد انصاری، نقش کراچی، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۹۸

۱۔ اردو نظم کا ارتقاء، ڈاکٹر محمد حسن، رسالہ آج کل، نظم نمبر، اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۹

ڈاکٹر اعجاز حسین نے حالؔی کی نظموں کے بارے میں اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

''نئے عنوان کے علاوہ ان کی نظموں میں سادگی، روانی، تسلسل اور ایک بڑی حد تک ہمواری، یکسانیت اور رنگی موجود ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ قومیت، اظہار شخصیت و وسعت نظر صداقت پسندی، جذبۂ ہمدردی اور کہیں کہیں سادگی اور بے تکلف سرمستی کلام میں خاصی دلکشی پیدا کر دی ہے۔''[۱]

بہر حال حالؔی کی نظموں میں فن اور ان کا شعری امتیاز اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ ان میں خلوص، صداقت، وسعت، جامعیت اور سادگی سب کچھ موجود ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ اردو میں انقلاب پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

حالؔی لاہور سے دہلی آئے تو سرسید کی تحریک سے وابستہ اور ان پر سرسید تحریک کے اثرات پڑنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری کو سرسید کے پیغام کی پیش کش کا ایک آلہ اور وسیلہ بنایا۔ حالؔی کی نظم مسدس مدوجزر اسلام اسی دور کی پیداوار ہے۔ اسی نظم میں انھوں نے قوم کو پستی اور زوال کا آئینہ دکھا کر اور ماحول کا صحیح احساس دلا کر اس کی اصلاح کی نہایت عمدہ کوشش کی ہے۔ سرسید کی تحریک کے اثر سے حالؔی نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں عام موضوعات وہی ہیں جن کی طرف سرسید نے توجہ دلائی تھی۔ ان نظموں میں ماضی کی روایات کا احساس ملتا ہے اور مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کا ذکر بھی۔

انیسویں صدی کے اختتام تک شعری فضا پر چھائے رہے آزادؔ اور حالؔی کے بعد ان

۱۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین، ص ۱۱۲

کے معاصرین میں شبلی، نذیر احمد، شوق قدوائی، وحیدالدین سلیم، اسماعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ، شاد عظیم آبادی، برق دہلوی، کیفی، چکبست، اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال، تلوک چند محروم کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان حضرات نے آزاد اور حالی کی روایت کے زیر اثر نظم کو فروغ بخشا اور اپنی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے اس کے فن میں توسیع کی۔

یہ شعرا اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لائے اور اردو شاعری کو ایک نیا رنگ دے کر اس کو ایک نئے انداز سے پیش کیا۔ چنانچہ ان کی نظموں کے موضوعات اور تصورات فطرت کی مصوری، جذبات نگاری، حب الوطنی اور قومی جذبات سے عبارت ہے۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ بعض نظم نگاروں نے مغربی نظم کے نمونوں کی پیروی کی اور ہیئت کے تجربے بھی کئے مثلاً نظم طباطبائی اور اسماعیل میرٹھی نے نظم معریٰ کو اردو شاعری میں برتا اور اپنا ایک الگ امتیاز قائم کیا۔

شبلی بھی آزاد اور حالی کی پیروی میں ان کی تیار کردہ شاہراہوں پر چلے۔ شاعری کے علاوہ اپنے زبردست علمی کارناموں اور تصانیف کے ذریعہ انھوں نے بلند مقام حاصل کیا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے مورخ، محقق، ناقد اور ماہر تعلیم تھے۔ جہاں تک نظموں کا تعلق ہے، شبلی کی نظموں میں روانی اور ترنم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کی بنیاد وقتی موضوعات اور ہنگامی حادثات کو بنایا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> شبلی کی نظموں میں معمولی واقعات کو شعری تجربے میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش ملتی ہیں۔ اور اسی لئے انھیں بجا طور پر اردو میں سیاسی اور موضوعاتی شاعری کا امام کہا جاسکتا ہے۔ شبلی کی نظموں

میں بیان کا خلوص، جذبے کی گرمی اور ترنم اور روانی کی اہمیت ہے۔''[۱]

شبلی نے بھی اپنے ہم عصر شعرا کے طرز پر داستان سنا کر قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نظموں کا دائرہ محدود ہے۔ تاہم انھوں نے اپنے کلام میں قومی زندگی اور سیاسی واقعات کو پیش کیا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی نظمیں وسیع پس منظر رکھتی ہیں۔ وزیر آغا کے الفاظ میں:

''شبلی کی نظموں میں حالات حاضرہ اور سیاسی و ملکی معاملات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی اجتہادی روش کے واضح نقوش ملتے ہیں۔''[۲]

''صبح امید'' شبلی کی ایک مؤثر نظم ہے۔ یہ شبلی کی شاعرانہ کوششوں اور صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ شبلی نے تاریخی اور اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اگر چہ یہ بات درست ہے کہ ان کی نظموں کی تعداد کم ہے لیکن ان کا یہ قلیل سرمایہ ہی اردو نظم نگاری کی تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

جدید نظم نگاری کے ارتقاء میں آزاد، حالی، اور شبلی کے بعد اسماعیل میرٹھی کو بھی اہم مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور سلام وغیرہ لکھ کر اردو شاعری میں اضافے کئے۔ ان کی شاعری میں جدید شاعری کی شان وشوکت نظر آتی ہے۔ نظم کو انھوں نے اپنا خاص میدان بنایا۔ ان کی نظموں میں تاریخی، قومی، سماجی، اخلاقی، علمی،

۱۔ اردو نظم کا ارتقاء، محمد حسن، آج کل، نظم نمبر، اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۱۰

۲۔ بحوالہ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۳۱

نیچرل اور دیہی زندگی کے عناصر ملتے ہیں۔ جن کی ترکیب سے انھوں نے اپنی شاعری میں امتیاز پیدا کیا اور زندہ موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے اپنے مشاہدے اور تجربے کو شاعری کا محور بنایا۔ علامہ نیاز فتح پوری نے رسالہ نگار میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

''ان کی نظمیں دبستانی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ اور حالی پہلے شخص تھے جو اردو کے قدیم رنگ کو بدل کر اسے مغربی انداز پر لے آئے۔''[۱]

ان کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظموں میں مقامی عناصر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اخلاقی تعلیم کا بھی اپنے شاعری کا ذریعہ پیغام دیا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لئے بکثرت نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں خدا کی کاری گری، گائے، کتا، بلّی، جگنو اور بچہ، ایماندار لڑکا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کو انھوں نے بچوں کی نفسیات کے مطابق لکھا ہے۔ یہ بے حد مقبول ہوئیں۔ مثلاً ''جگنو اور بچہ'' ان کی بہترین نظم ہے۔ اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سناؤں تمہیں بات اک رات کی — کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی
چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں — ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں
پڑی ایک بچے کی نظر ان پر — پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر
چمک دار کیڑا جو بھایا اسے — تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے

اسماعیل میرٹھی اپنی نظموں میں عام طور پر موضوع اور اس کے معیار کے مطابق الفاظ

۱۔ نیاز فتح پوری، نگار، ستمبر ۱۹۳۸ء، ص ۷۶

کا انتخاب کرتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کے پیش نظر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ اسلم کی بلّی، ہماری گائے، پن چکی، صبح کی آمد، تاروں بھری رات وغیرہ بھی ان کی نا قابل فراموش نظمیں ہیں۔ نظم ''صبح کی آمد'' سے دو بند ملاحظہ ہو۔

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں　　اجالے زمانے میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں　　پکارے گلے صاف چلا رہی ہوں
اٹھو سونے والوں کہ میں آ رہی ہوں

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے　　خوشی سے ہر ایک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے　　سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اٹھو سونے والوں کہ میں آ رہی ہوں

ان نظموں میں ان کی فضا وہی ہے جس میں ہم روز چلتے پھرتے ہیں۔ ان کی ان نظموں میں جدیدیت کی بازگشت سنائی دینے لگی ہے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اردو نظم کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اور اس کو فن کے تمام راستوں سے واقف اور لوازم سے روشناس کرایا ہے۔ بقول سیفی پریمی/خلیل الرحمٰن:

''مولانا اسماعیل میرٹھی نے شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی اور عقلیت اور اصلیت کے امتزاج سے شعر کی تخلیق کی۔''[۱]

یہ بات بالکل درست ہے کہ ان کی شاعری میں فکر و فن کی پیش کش کے نئے انداز

۱۔ اسماعیل میرٹھی حیات اور خدمات، ڈاکٹر سیفی پریمی خلیل الرحمٰن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۲۴ء، ص ۱۶۷

ملتے ہیں۔ اس لئے جدید شاعری میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں اور تخلیقی کاوشوں کی خاصی اہمیت ہے۔

انیسویں صدی کے آخری زمانے میں اردو نظم نگاری کے ارتقائی دور میں اکبر الہ آبادی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی طرف بھرپور توجہ کی اور اردو میں نئے انداز کی نظمیں لکھ کر شاعری کو نئے پن کے احساس سے آشنا کیا۔ اکبر اپنے عہد کے بہت پڑھے لکھے ذی شعور، قومی ہمدردی کے پیکر اور بہت حساس انسان تھے۔ وہ اسلامی دائرے میں منضبط رہتے ہوئے قومی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر میں رہتے تھے اور اپنی شاعری کو اس کام کے لئے وقف کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا دل قومی اور ملی جذبات سے دھڑکتا تھا۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''اکبر کی شاعری کا نصب العین ہندوستان میں جدید سماج کی تعمیر تھی جس میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ اپنے اور روایات کے تحفظ کا خاص طور پر احساس ہو مسلمان ہو کہ ہندو کہ پارسی ہو کہ عیسائی جس کی وہ اپنی قوم مذہب اور اپنی روایت سے روگراں دیکھتے تھے۔ اس پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں سے ان کو فطری لگاؤ تھا اسی لئے ان کی تنقیدوں اور ہجوؤں کے مخاطب زیادہ تر مسلمان ہی بنے۔'' [۱]

ان کے یہاں روایت سے انحراف بھی ملتا ہے اور نئے تجربے کی جھلک بھی ان کی

۱۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص ۱۵۹

شعری تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں افادیت سے معمور قومی شعور بھی ہے اور شاعری میں فن کے نئے معیار قائم کئے ہیں۔ اکبر نے اپنے مخصوص رنگ میں نظمیں، قطعات، رباعیات وغیرہ اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہیں۔ طنز وظرافت ان کا مخصوص میدان ہے۔ سماج میں جہاں بھی کوئی برائی نظر آتی ہے اس پر وہ طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سرسید تحریک بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی اور انھوں نے اسے بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام کے نتائج کے خدمات پر اس زمانے کے رواج کے مطابق اکبر بھی طنز کرتے تھے۔ سرسید پر ان کے طنز کی چند مثالیں پیش ہیں:

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں سرسید نے　　کردیا کعبہ کو گم اور کلیسہ نہ ملا
رنگ چہرہ کا تو کالج نے بھی رکھا قائم　　رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے　　شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

اسی طرح اکبر نے مغربیت سے متاثر طرزِ زندگی کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً:

طریقِ مغرب کیا ہے یہی روشن ضمیری ہے　　خدا کو بھول جانا اور محوِ ماسوا ہونا
مغربی رنگ وروشن پر کیوں نہ آئیں اب فلوس
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

اکبر کی شاعری کا دور غدر کے بعد کا زمانہ تھا۔ اس وقت قوم کی حالت بہت خراب تھی۔ مغربیت کا دور دورہ تھا۔ اعجاز حسین لکھتے ہیں:

''.....اکبر کے دور میں مغرب اور مشرق کا امتزاج یا تصادم اپنے شباب پر تھا۔ مغرب کا تمدنی سیلاب مشرق کی بنیادی

خوبیوں کو بھی بہائے لے جاتا تھا۔ عام طور سے لوگ بغیر تہ تک
نہ پہنچتے ہوتے تحریکات سے مغلوب ہو رہے تھے۔ بغیر روح کے
جسم متحرک ہو گئے تھے۔ انگریزوں کی روح اور ان کی ترقی کے
اسباب پر نظر نہ تھی۔ لباس و معاشرت نقالی سے انگریز بننے کو ایک
عام خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اکبر دوراہے پر کھڑے تھے۔ ان کی
نظروں میں مشرقی تمدن و تخیل کا پورا نقشہ تھا۔ ان کی رگوں میں
ہندوستان کا خون تھا وہ ماضی و حال کی نبض پر انگلیاں رکھ کر اپنے
دور کی تبدیلی کا اندازہ کر رہے تھے اور جو محسوسات تھے ان کو شعر
بنا کر پیش کر رہے تھے جو بڑا مشکل کام تھا۔ آج ان کی یہ پیش کش
ممکن ہے آسان نظر آئے لیکن اس عالم اور اس وقت کو سوچئے کہ
جب ان کے سامنے اس احساس کو روبہ کار لانے کے لئے کوئی
نمونہ ادب میں نہ تھا۔'' [۱]

حقیقت یہ ہے کہ اکبؔر، حالی کی اصلاحی تحریک کے نشیب و فراز دیکھ رہے تھے اور قوم پر ان کی شاعری کا اثر محسوس کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرسید و حالؔی کی کوششوں اور مغرب کی پیروی سے قوم بگڑ جائے گی۔ لہٰذا انھوں نے اسی کو مدنظر رکھ کر اپنی شاعری میں مغربی تہذیب کو نشانہ بنایا اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت بن گئی۔ اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''سودا کے زمانے میں سماج کی وہ طنزیہ تنقید ممکن ہی نہ تھی جو اکبر

۱۔ اکبر الہ آبادی، اعجاز حسین، آج کل، اپریل ۱۹۵۷ء، ص ۳۳

کا مخصوص حصہ تھی۔ اکبر کا قدم پرانی تہذیب پر جما ہوا تھا۔ اور وہ
اس.....سوئی ہوئی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں اور تن تنہا اس
یلغار کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسی مقصد میں اپنی فطری طنز وظرافت
سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی تیز اور باریک بین نگاہیں دشمن کی کمزور
کڑیوں کو اپنی طنز وظرافت سے قطع و پرد کرتے ہیں۔'' [۱]

اکبر الہ آبادی کی کلیات قوم کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر اور ہر نظم میں سوز و گداز موجود ہے اور جس کو ان کی حقیقت نگاری نے اور زیادہ مستحکم کر دیا ہے۔ وہ طنز وظرافت کے پیرایے میں معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور تعلیمی غرض زندگی کے ہر شعبے کے نقائص کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ پردے کے سخت حامی تھے۔ عورتوں کی بے پردگی سے ان کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ ان پر طنز کے وار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں کی غلماں تو ہیں
خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا
ان سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہا رکھی ہے روٹی رات کی

اکبر نے اپنے کلام میں بے شمار مسائل کو سمویا ہے اور زندگی کے تمام مباحث پر

۱۔ سخن ہائے گفتی، کلیم الدین احمد، ص ۲۰۶

انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی نظمیں مغربی طرزِ تعلیم، ہندی لڑکیاں، مجنوں کی توبہ، تعلیم نسواں، برق کلیساں وغیرہ بہت دلچسپ ہیں۔ رسالہ مخزن میں شیخ عبدالقادر سروری نے بالکل صحیح لکھا ہے:

> ''اکبر روشن خیالی کے ساتھ مشرقی کی سچی محبت کا واعظ ہے اس کے نزدیک ہر مشرقی نژاد کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے اور اپنے ہر رسم و رواج کے خلاف، بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو، اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے۔ یہ خیالات اس زور اور خوبی کے ساتھ ان کے معاصرین میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتے۔''[۱]

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اکبؔر نے اردو شاعری کو ایک نئی زندگی، نیا شعور اور نئی آب و تاب سے معمور کیا۔ اپنے اندازِ بیان کو وقت کے تحت ڈھالا ہے۔ اس تصور کو بعد میں آنے والی نسلوں نے بھی کم و بیش قائم رکھا۔

حالؔی، آزاؔد، شبلؔی اور اکبؔر کے بعد اردو نظم کے میدان میں چکبست نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ کر اردو نظم کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ چکبست کی شاعری کا زورِ قلم وطنی نظموں میں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اردو کے ادبی سرمائے پر ایسے گراں بہا نقوش چھوڑے ہیں جو آج بھی ادبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ میں بے حد اہم ہیں۔ لہٰذا چکبست نے اپنی شاعری کی اساس اسی پس منظر کے تحت رکھی۔ حالانکہ چکبست کی نظموں

۱۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری، عبدالقادر سروری، رسالہ مخزن، جولائی ۱۹۴۶ء، ص ۶۷

کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر انھوں نے حب وطن کے موضوع پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ اس میں انھوں نے اگر چہ کسی غیر معمولی جدت سے کام نہیں لیا ہے لیکن حب الوطنی کا جذبہ جو قوم کی بیداری کا سبب ہے، اس کو انھوں نے اپنی شاعری کا محور بنایا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مقالے چکبست بحیثیت پیامبر دور جدید میں یوں رقمطراز ہیں:

''انیسویں صدی جاتے جاتے ہمیں ایک مبہم سا قومی تصور دیتی گئی اور چکبست اسی دور کی پیداوار ہیں۔ تقریباً ۱۹۱۷ء تک ہندوستانی بیداری کا یہی پیام رہا کہ ہم میں وطن کی محبت پیدا ہو۔ وطن سے محبت کرنے والوں سے محبت پیدا ہو۔ ہندوستان کو ایک قومی حیثیت دی جائے اور ملکی انتظام میں ہندوستانیوں کا بھی ہاتھ ہو۔'' [۱]

غرض چکبست کی شاعری کا اختصاص یہی ہے کہ انھوں نے تہذیبی اور حب الوطنی سے مملو موضوعات کو اپنی شاعری میں کثرت سے بیان کیا ہے اور ہندوستان کی عظمت اور وطن کی محبت کے نغمے گائے ہیں۔ ان کی نظمیں خاک ہند، وطن کا راگ، آوارہ قوم، نالۂ درد، ہمارا وطن وغیرہ اسی جذبہ کی عکاس ہیں۔ ان کی نظم خاک ہند سے یہ بند ملاحظہ ہو۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیض قدرت ترے لئے رواں ہے
تری جبیں سے نور حسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزوشاں ہے
ہر صبح ہے بہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتی ہے چوٹی ہمالیہ کی

۱۔ تنقیدی جائزے، احتشام حسین، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، طبع سوم، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۱

خاک ہند چکبست کی ایک ضرب المثل نظم ہے۔اس نظم میں انھوں نے حب الوطنی کا تاثر اپنی پوری کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس طرح سے ان کی نظمیں وطنی نظم نگاری کا سرمایہ ہے۔ڈاکٹر شارب ردولوی اپنے مقالے چکبست کی شاعرانہ اہمیت میں لکھتے ہیں:

''چکبست کی شاعری درحقیقت زندگی کا آئینہ ہے جس میں ان کے دور کی سماجی، معاشرتی، تہذیبی، اصلاحی تحریکات اور ان کی کشمکش کی بڑی واضح تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔'' [۱]

عبدالحق، ادب اور چکبست کے عنوان سے اپنے مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے۔ وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔'' [۲]

چکبست کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں وطن دوستی، جوش، اصلاح کے ساتھ ساتھ اچھی شاعری کی عمدہ مثال ہیں۔ان میں انسانی ہمدردی اور دردمندی کا بھی گہرا شعور ملتا ہے۔ان کی بعض نظمیں بہت دلکش اور پُر اثر ہیں۔''رامائن کا ایک سین'' ان کی اسی طرح کی نظم ہے۔کلام میں صفائی اور بیان میں وسعت اور ٹھہراؤ ہے۔ ان کی ایک کامیاب ترین نظم ہے۔اس نظم کے لہجہ میں انیسؔ کے لہجہ کی مماثلت پائی جاتی ہے۔چکبست نے مرقع نگاری، منظر نگاری کے بھی کامیاب نمونے پیش کئے ہیں۔اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

۱۔ مضمون چکبست کی شاعرانہ اہمیت، شارب ردولوی، آج کل، فروری ۱۹۸۳ء، ص ۱۷

۲۔ یاد چکبست، مولوی عبدالحق، مرتبہ پنڈت آنند نرائن پریس لمیٹیڈ، الہ آباد، ۱۹۳۹ء، ص ۹۰۸

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ کمال
دیکھا تو ایک در میں وہ بیٹھی ہے خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے یہ شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

چکبست کی شاعری کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس کردار کا انتخاب کیا ہے اس کو انھوں نے پوری کامیابی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے رامائن کے سین میں ماں کے کردار کو پیش کیا ہے۔ اس میں بیٹے سے متعلق ماں کے جذبات کے بیان میں بڑی صفائی اور روانی سے کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہوں میری جان
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھ تارے کو بھیج دوں

جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

جدید نظم نگاروں کی فہرست میں سرور جہاں آبادی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے بھی نظم نگاری پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ انھوں نے نظم کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کرایا اور اردو شاعری کو گونا گونی عطا کی۔ ان کی شاعری کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سرور جہاں آبادی نے اپنی شاعری کو اخلاقی، سماجی اور اصلاحی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور مجموعی اصلاح کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے۔ حالانکہ وہ انگریزی سے بہت زیادہ واقف نہیں تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی ذہانت و محنت کی بدولت انگریزی لفظوں کو اردو میں ترجمہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ باوا کرشن مغموم اپنے مضمون سرور جہاں آبادی میں لکھتے ہیں:

''سرور کے تراجم زبان و بیان کے محاسن سے مالا مال ہیں اور ان کی نقل (یعنی ترجمہ) میں ''اصل'' کا مزہ ہے اور یہ محض ان کی قادرالکلامی تراجم پر ان کی طبع زاد نظموں کا گمان ہوتا ہے۔'' [۱]

سرور جہاں آبادی نے جس زمانہ میں اپنی شاعری شروع کی تھی وہ اس وقت ملک حب الوطنی کا زمانہ تھا۔ حالؔی اور ان کے معاصرین حب الوطنی کے موضوع پر نظمیں لکھ رہے تھے۔ حب الوطنی کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ سرور بھی اس جذبہ سے متاثر ہوئے اور نظمیں لکھیں۔ انھوں نے حب الوطنی کے موضوع پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں عروس حب وطن،

۱۔ مضمون سرور جہاں آبادی، باوا کرشن مغموم، مشمولہ: زمانہ، مارچ اپریل ۱۹۴۹ء، ص ۱۰۹

چشمۂ وطن، پھولوں کا کنج، سرزمین وطن، خاک وطن، مادرِ وطن اور بادِ وطن، جلوۂ امید، قومی نوحہ، بلبل اور میں وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظم خاک وطن سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آہ اے خاک وطن! اے درد مند بے قرار — آہ اے شوریدہ قسمت، اے پریشاں روزگار
اڑ رہا تھا پرچم شہرت تیرا افلاک پر — سرنگو ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر
تیری شہرت کے نگیں خاک عدم میں ہے نہاں — اب نہ وہ تخت مرصع ہے نہ تاج زرفشاں
تیرے جنگل اب بھی ہیں خاکِ وطن مہماں نواز — تیرے پتلے میں ہے قدرت کی ادائی جاں نواز

سرور کی حب الوطنی کے جذبے کے بارے میں حکم چند نیرؔ لکھتے ہیں کہ:

''سرور نے مادرِ وطن کی عظمت کے گیت اس طرح محبت سے سرشار ہوکر لکھے ہیں کہ ان کی حب الوطنی ایک دیش بھکت کی دیش بھکتی اور سچے پجاری کی پوجا کے درجے کی چیزیں بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کی شخصیت کے بے پناہ خلوص اور عقیدے کی طہارت نے اس بھکتی میں عبادت کی شان پیدا کردی ہے۔ ان کے کلام میں مادرِ وطن کے لئے جو احترام اور عزت ہے وہ اردو شاعری میں آج بھی بلند ترین ہے۔ سرور پہلا شاعر ہے جس نے اردو زبان و ادب میں وطن کے لئے ماں کا مقدس نام تصور پیش کیا ہے۔''[۱]

۱۔ سرور جہاں آبادی حیات اور شاعری، حکم چند نیر، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۷

ان کی نظم مادرِ ہند سے چند اشعار پیش خدمت ہے۔

ہاں تیری چاندنی راتوں کا منظر خوشنما　　واہ یہ اشجار یہ پھولوں کے زیور خوشنما
سو تبسم ترے انداز تکلم پر نثار　　دل کو کرتی ہیں تری دلکش صدائیں بیقرار
سرزمین عیش ہے اے مادرِ دل سوز تو
آرزوؤں کی بزم انبساط افروز تو

سبزۂ خودرو کا گہوارہ ہے تری سرزمین　　تختۂ خلد بریں ہے تری خوش منظر زمیں
پاک گنگا جل سے ہے بڑھ کر ترا آب ظہور　　ترے پاکیزہ ثمر ہیں میوۂ شاخِ سرور
آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تو
خلد کی ہے پاک دیوی مادرِ وساز تو

سرور کی حب الوطنی، مادرِ وطن سے والہانہ محبت کا نتیجہ ہے اسی لئے سرور نے عقیدت ومحبت سے سرشار ہوکر مادرِ وطن کا نغمہ گایا ہے۔ان کی قومی وملی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ان کی وطنی شاعری کی شان دوسری ہے یہ قدیم وجدید کی کشمکش سے آزاد معلوم ہوتی ہے اس کے جذبے میں سادگی خیال میں معصومیت اور محبت میں عقیدت کا عنصر ملتا ہے..... ان کی وطن دوستی بے میل، بے ریا اور بے لوث ہے۔ یہ اجتماعی احساس سے نا آشنا نہیں لیکن سیاست کے نشیب وفراز سے بلند و بے نیاز ہے۔''[۱]

۱۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور شاعری، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، ص ۲۰۷

سرور نے مناظر فطرت پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بہار چمن، نسیم سحر، لالۂ صحرا، بیر بیوٹی وغیرہ ان کی فطرت نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ ان نظموں میں سرور کا فن اپنے کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ ان کی نظم ''لالہ صحرا'' سے یہ بند ملاحظہ ہو۔

پسند لالۂ صحرا تیرے فضا ہے مجھے　　چمن کے پھولوں سے دلکش تیری ادا ہے مجھے
بہشت خاند ترا کنج خوش نما ہے مجھے　　جنوں میں تیرا نظارہ سکوں فزا ہے مجھے
گلوں سے ہے مجھے تیرے جگر کا داغ پسند
وہ رند ہو کہ ترا مجھے ایاغ مجھے

سرور نے اپنی نظموں میں مناظرِ فطرت کی عکاسی بہت خوبصورت اور دلکش انداز میں کی ہے۔ اگر وہ کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو اس کے کئی طرح کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ حکم چند نیر لکھتے ہیں کہ:

> ''سرور کے یہاں فطرت نگاری کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے فطرت کو مختلف انداز سے دیکھا ہے اور عارض فطرت کی صحیح اور سچے جلوے پیش کئے ہیں۔ ان کی بولتی ہوئی تصویروں میں بڑی دلکشی اور دل آویز مرقع قیاسی اور خیالی تصویروں سے یقیناً مختلف ہیں۔'' [۱]

سرور صاحب کی دوسری نظم بیر بیوٹی بھی فطرت نگارے سے مملو ہے ان کی نظم سے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سرور جہان آبادی حیات اور شاعری، حکم چند نیر، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء، ص ۲۵۰

آہ او ننھے سے کیڑے نازش صحرا ہے تو　　دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گل رعنا ہے تو
صفحہ ہستی پہ اک نقشِ تحرزا ہے تو　　شعلۂ راز حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو
برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتش یاقوت کی ننھی سی منقل ہے کوئی

کچھ عجیب عالم ہے تیری جس کے انداز کا　　سرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرداز کا
قطرۂ مضطر سے خونِ کشتگانِ ناز کا　　قلب خون گشتہ ہے مژگاں پر کسی جاں باز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمین پر جلوہ گر
جام زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ:

''نظم میں منشی درگا سہائے صاحب سرور جہاں آبادی کے جادو نگار قلم نے بیر بیوٹی کی تصویر کشی میں حد درجہ پسندیدہ الفاظ اور نئی نرالی تشبیہوں سے کام لیا ہے۔''[1]

سرور کی ان منظر نگاری اور فطری نظموں میں ان کا کمالِ فن اپنے عروج و شباب پر ہے۔ سرور صاحب کے کمال کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ سرور کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری کا اثر ان کے بعد آنے والی نسل نے قبول کیا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرور جہاں آبادی کی شاعری اردو نظم نگاری میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

اردو نظم کے ارتقاء میں علامہ اقبال کو ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ آزاد،

۱۔　اردو معلیٰ، حسرت موہانی، بابت ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۸

حالی، شبلی اور اسماعیل میرٹھی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے فکری وفنی اور اسلوبیاتی تینوں سطح پر صنف نظم میں غیر معمولی اضافے کئے۔ انھوں نے نظم کے افق کو وسیع کر کے اس کو ایک نئی لے سے روشناس کرایا۔ نیز اپنے مخصوص ومنفرد تصورات و خیالات اور نظریات پیش کر کے اردو نظم کو نئی فکری اور معنوی بلندیوں سے ہم آہنگ کرایا۔ ان کی شخصیت اردو نظم نگاری میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اقبال کے یہاں نظم کا تصور بالکل منفرد ہے۔ وہ نظموں میں فکری تصورات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کے ابتدائی عہد میں نظم نگاری میں تین رجحانات عام تھے۔ انگریزی کے رومانی شعراء کے زیر اثر مناظرِ قدرت اور مظاہر فطرت کی تصویر کشی اور ان سے لطف اندوزی، دوسرا حب وطن کا موضوع اور تیسرا بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کا رجحان۔ اقبال نے اپنی مخصوص صلاحیت ومزاج کے تحت تینوں موضوعات پر طبع آزمائی کی اور شاعری کے اچھے نمونے پیش کئے۔ یوں تو انجمن حمایت اسلام ۱۸۹۹ء کے جلسہ میں انھوں نے اپنی نظم ''نالہ یتیم'' بڑے مؤثر انداز میں پیش کی تھی جو آزاد اور شبلی سے براہِ راست اثر پذیری کی مظہر ہے لیکن ان کے پہلے مجموعہ کلام کی اولین نظم ''ہمالہ'' ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے فکر وفن، تخیل کی بلندی، مشاہدے کی تازگی اور فنی حسن کے پیکر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا ہے۔ مثال کے طور پر ''ہمالہ'' کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان　　چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں　　نوجواں ہے تو گردشِ شام وسحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا　　دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو خدا　　وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اقبال نے اس نظم میں فطرت نگاری، خیال کی جدت اور اسلوب کی روانی کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ہمالہ سے خطاب کر کے اس کی عظمت، رفعت اور قدرتی حسن کا خاکہ بہت حسین اور پرکشش انداز میں پیش کرایا ہے۔ اس نظم کی خصوصیت فطرت نگاری کی پیش کش میں محض صنائع لفظی و معنوی کے اظہار تک محدود بلکہ اس میں فن کے وہ تمام عناصر و لوازم موجود ہیں جو حسن و جمال اور رنگ و بو کے تصوراتی پیکروں کے لئے ضروری ہیں۔ ''ہمالہ'' سمیت اقبال کے کلام کی ابتدائی دور کی نظموں میں مشاہدے سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ملتی ہے۔ عام طور پر یہ نظمیں منظر نگاری اور جذبات نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''ایک شام'' نظم میں اقبال نے مصورانہ ذوق کو فطرت سے بہت قریب رکھا ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوافروش خاموش　　کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے　　آغوش میں شب کے سوگئی ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے　　یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا　　قدرت ہے میرا قبضے میں گویا
اے دل! تو بھی خاموش ہوجا
آغوش میں غم کو لے کے سوجا

یوں تو اقبال نے مغربی شعرا نٹشے، برگساں، ہیگل وغیرہ کے گہرے مطالعہ کی بنا پر بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ان شعرا کے طرز پر انھوں نے کچھ نظمیں بچوں کے لئے بھی لکھی ہیں۔ ان میں ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب وغیرہ شامل ہیں۔ یہ نظمیں انھوں نے بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی ہیں۔ ان نظموں میں ان کا انداز بیان سادہ اور زبان سلیس ہے۔

''بانگ درا کی دیگر بہت سی نظموں میں بھی فطرت نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا مصورانہ ذوق فطرت سے بہت قریب ہے۔ ان کی نظموں کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے فطرت کا منظر رقص کر رہا ہو۔ ایک مثال بزم انجم سے پیش کی جاتی ہے:

سورج نے جاتے جاتے شام سیاہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

اقبال کے فن میں جذبہ و تخیل اور فکر و فن کی جھلکیاں شانہ بہ شانہ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ ان کے لطیف تصورات اور ادبی مصوری کی شاعرانہ حسن و کمال پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''ایک آرزو'' کے متعدد اشعار اس کے مظہر ہیں۔ یہاں صرف ایک شعر پیش ہے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہوں

''بانگ درا'' کی دوسری نظمیں تصور درد، نالہ فراق، شکوہ، جواب شکوہ، ساقی نامہ، طلوع اسلام، والدہ مرحومہ کی یاد میں، شمع وشاعر اور خضر راہ وغیرہ بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں فکر کے ساتھ ان کا فنی حسن اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے۔ یہ تمام نظمیں اقبال کی شناخت بھی کہی جاتی ہیں اور اقبال کی عظمت متعین کرتی ہیں۔

''بانگ درا'' میں ان کی نظم خضرِ راہ کو بھی ان کے فکر وفن میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں خضر راہ کو اردو شاعری کا عہد نامہ جدید قرار دیا ہے۔ اس نظم کو انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھا تھا۔ اس کی تاثیر پذیری کا یہ عالم تھا کہ بقول سلیم چشتی:

> ''جب وہ اس نظم کو پڑھ رہے تھے تو وفور جذبات سے ان کی طبیعت بالکل بے قابو تھی۔ وہ اکثر پڑھتے پڑھتے رک جاتے اور .....آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔'' [۱]

''بانگ درا'' کی آخری نظم طلوع اسلام بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر سلیم چستی اس طرح لکھتے ہیں:

> ''بندش اور تراکیب، مضمون آفرینی اور بلند پروازی رمز وکنایہ کی فراوانی اور مشکل پسندی، شوکت الفاظ اور فلسفہ طرازی، غرض کہ صوری اور معنوی محاسن شعری کے اعتبار سے یہ نظم ''بانگ درا'' کی تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔'' [۲]

۱۔ بانگ درا، شرح سلیم چشتی، ۱۹۹۱ء، ص ۷۰۲

۲۔ ایضاً، ص ۷۳۱

نظم طلوع اسلام سے صرف چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دوراں گراں خوابی
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

''بانگ درا'' کے بعد بال جبریل کی نظموں میں اقبال کے فن میں مزید توضیح و تکمیل نظر آتی ہے اور انھوں نے اپنے مخصوص نظریات و تصورات کو اپنے فن کی بنیاد بنایا ہے۔ اقبال نے اپنے فکر و فن کی بنیادیں اسلامی نظریات اور اسلامی نظام حیات پر رکھی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ حضرتِ انسان کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔ یہ پیغام ان کے نظریہ خودی میں مضمر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے اس کے لئے اسے کچھ اعلیٰ وارفع صلاحیتیں عطا کی ہیں جنھیں عشق اور مسلسل جہد و عمل کے ساتھ وہ بروئے کار لاکر کائنات کی تسخیر کرسکتا ہے۔ اسی طرح ان کا تصور عشق ایک زبردست محرک عمل اور قوت ہے۔ خودی، عشق اور شعر کے ذریعہ انسان مردِ مومن اور مردِ کامل کی صفات کا حامل ہوجاتا ہے۔ اور وہ نٹشے کے فوق البشر کی تخریبی اور جابرانی صفات سے محفوظ لیکن اسی کے بالمقابل دنیا کی ایک ایسی طاقت ترین ہستی بن جاتا ہے اور خلافت کا استحقاق حاصل کرسکتا ہے۔

اقبال کی متعدد نظموں میں خودی اور عشق کا بھرپور واضح اور جامع تصور پیش کیا گیا

ہے۔ انھوں نے بال جبریل کی معرکہ آرا نظم ''ساقی نامہ'' میں اس موضوع پر باقاعدہ دو بندوں میں خودی اور اہل خودی کی اہمیت واضح کی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے　　خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداری کائنات
خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اگر چہ اقبال کے نزدیک خودی کا تصور بہت وسیع ہے۔ خودی کا نشو ونما و استحکام کے لئے عشق مسلسل، سعی و عمل وغیرہ صفات سے متفق ہونا ضروری ہے۔ اقبال کے فکری نظام میں خودی کے تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس نے انسان کو اس کی عظمت سے آگاہ کیا اور خودی کی بلندی اور اپنی ذات کے عرفان کو کامیابی کا ذریعہ بنایا۔ اقبال نے اپنی شاعری کو مقصدی اور پیغامی ہونے کے ساتھ ساتھ فنی حسن کی انتہائی بلندیوں تک بھی پہنچایا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اقبال کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اقبال کی عظمت کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں ہمارے تمام شعراء سے زیادہ واضح طور پر بیسویں صدی کی زندگی کے تمام موڑ اور نشان ملتے ہیں۔ دراصل اس دور کا کوئی اہم واقع اور حادثہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو۔'' [۱]

اقبال پر گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی تامل نہیں کہ انھوں نے نہ

۱۔ دانشور اقبال، آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص ۲۴۷

صرف اپنے تخلیقات کے تمام تر میدانوں میں امتیاز حاصل کیا بلکہ اردو نظم نگاری کو نئی سمتوں سے آشنا کرایا اور بعد کے شعرا کے لئے بہترین فکری وفنی راستے ہموار کر دیئے۔ اقبال اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس طرح آزاد و حالی نے بعد کے شعرا پر غیر معمولی اثر ڈالا اور جوق در جوق لوگ کارواں نظم نگاری میں شامل ہوئے۔ اسی طرح فکر وفنی اعتبار سے اقبال نے بھی اپنے معاصرین اور مابعد شعرا پر گہرا اثر ڈالا جس کے نتیجے میں بہت سے شعرا نے بہت سنجیدگی سے نظمیں لکھیں اور اس طرح نظم میں کئی روایت قائم ہوئی۔ اپنی نظموں کے توسط سے اقبال نے جو نظریات وتصورات پیش کئے بعد کے بعض شعرا اگر چہ فکری اعتبار سے ان سے متفق نہیں بھی ہوئے تب بھی انھوں نے فن واسلوب میں اقبال کی پیروی کی اور ان کی پیش کردہ بنیادوں پر اپنی شعری عمارت تعمیر کی۔ ان شعرا میں سیماب، ظفر علی خاں، حامد اللہ افسر، جوش اور جمیل مظہری وغیرہ شامل ہیں۔ ان حضرات نے اردو نظم نگاری میں گراں قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔

جوش اور سیماب اس دور کے اہم شعرا ہیں۔ ان دونوں نے اردو نظم کو ایک انقلابی رنگ عطا کیا۔ جوش کی انقلابی اور باغیانہ نظموں کا ایک الگ لب ولہجہ اور انداز نگارش بالکل منفرد ہے۔ اردو شاعری میں متنوع اور ہمہ گیر شاعر کی حیثیت سے ان کا امتیازی مقام ہے۔ وہ بہ یک وقت شاعر شباب بھی ہیں اور شاعر انقلاب بھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی انقلابی و اجتماعی قسم کی نظموں نے ہی انہیں شاعر انقلاب کا خطاب دلوایا ہے۔ جوش کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مناظر فطرت کو اپنی شاعری میں بہت نمایاں جگہ دی ہے۔ اس طرح کی نظموں میں وہ حقیقت نگاری کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ انھوں نے فطرت نگاری اور جذبات سازی سے معمور جو نظمیں لکھی ہیں ان میں برسات کی شفق، برسات کی

پہلی گھٹا، شام اور اس کی بزم آرائیاں، بدلی کا چاند، چاندنی، البیلی صبح وغیرہ بہت امتیازی نظمیں ہیں۔ جس میں ان کی جدت طرازی، حسن تخیل اور اسلوب کی روانی اپنے حد کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ ان کے یہاں خیال کی گہرائی اور وسعت ہے وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ لفظ ان کے ہاتھ میں موم ہو جاتے ہیں۔ شبابیات کے بیان میں جوش کا بدل موجود نہیں۔ بحیثیت مجموعی جوش نے اردو نظم نگاری کے ارتقاء میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیماب اکبر آبادی کا بھی اردو نظم نگاری میں بہت اہم مقام ہے۔ چونکہ میرا یہ تحقیقی مقالہ سیماب اکبر آبادی کی شاعری سے متعلق ہے۔ اس لئے نظم نگاری میں ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ باقاعدہ ایک مستقل باب میں لیا جائے گا۔ اس لئے یہاں ان کا ذکر حذف کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس باب کا دائرہ بھی نظم کے آغاز سے سیماب کی نظم کے ارتقاء تک محدود ہے اس لئے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو سے صرف نظر کرتے ہوئے بعد کے نظم نگاروں کی صرف فہرست پیش کی جارہی ہے۔

تلوک چند محروم اور ظفر علی خاں کی نظم نگاری میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انھیں نئی بدلتی ہوئی قدروں کا گہرا شعور تھا۔ ظفر علی خاں، اقبال کے انقلابی تصورات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں خالص سیاسی انداز اختیار کیا۔ تلوک چند محروم نے بھی اردو نظم میں گراں بہا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی نظموں کی اپنی انفرادیت ہے۔ حب الوطنی پر بطور خاص انھوں نے توجہ دی ہے۔

اس کے بعد اردو نظم کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو نسل سامنے آئی اس نے اپنے ان بزرگوں کی تقلید کر کے اور اس میں بہت کافی اضافے اور توسیع کر کے اپنے کمالِ فن سے اردو نظم کو بلندیوں کی انتہاؤں تک پہنچایا۔ ان باکمال شعراء میں ن۔م۔راشد،

میراجی، ساحر لدھیانوی، مجاز، فیض، اختر الایمان، ریاض خیرآبادی، سلام مچھلی شہری، جاں نثار اختر، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، سکندر علی وجد، احسان دانش، مخدوم، سردار جعفری، جذبی، جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، جمیل مظہری، آنند نارائن ملاّ، غلام ربانی تاباں وغیرہ شامل ہیں۔ان کا شمار بیسویں صدی کے دورِ ربع کے ممتاز شعرا میں کیا جاتا ہے۔

ان شعرا میں سے بعض نے تو اپنے عہد کی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے میلانات سے ہم آہنگ کیا اور موضوعاتی تنوع، رنگارنگی سماجی اور سیاسی شعور، نفسیاتی رجحانات وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔اور بعض شعرا نے اپنا رخ بدل کر جدیدیت کے رجحانات کی تائید کی اور نئے تقاضوں کے تحت نظمیں لکھیں۔ کچھ عرصہ تک جدیدیت کی تعریف اور اس کے مسائل کے سلسلے میں ابہام اور کثرتِ تعبیرات کے دھندلکے سے نکل کر جدیدیت کا واضح شعور رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ شعرا نے نظم کو جدیدت سے آشنا کیا اور نظم کا نیا مزاج پیدا کیا۔ ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، مظہر امام، مظفر حنفی، بشیر بدر، ندا فاضلی، حرمت الاکرام، کمار پاشی، شہریار، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی بطور خاص شامل ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شعرا ہیں جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی شاعری کی اور اس سے آئندہ نسل کے لئے نظم نگاری کی بہترین راہیں ہموار کیں۔ یہی نسل اکیسویں صدی کے مسائل اور نئی نظم کے موضوع وفن میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور مستقبل کے ادبی امکانات تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

بابِ دوم

سیماب کے نظمیہ مجموعوں کا مطالعہ

(الف) نے ستاں

(ب) کارِ امروز

(ج) ساز و آہنگ

(د) شعرِ انقلاب

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں سرسید احمد خاں کے ذریعہ قومی بیداری کی جو مہم شروع ہوئی تھی، اس میں اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان حضرات نے مجلسِ مناظمہ کی بنیاد ڈال کر اردو شاعری کے رخ کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا اور نظم جدید کا آغاز کیا تھا۔ غزل میں قافیہ و ردیف اور ایک ہی شعر میں بات مکمل کرنے کی جو سخت پابندی تھی، نظم میں اس پابندی سے نجات مل چکی تھی۔ شاعر آزادی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکتا تھا اور ایک موضوع پر پوری نظم لکھ سکتا تھا۔ اس طرح حسن و عشق، شراب و خمریات اور دوسرے بندھے ٹکے موضوعات سے باہر نکل کر مناظر قدرت، مظاہر فطرت اور نیچر کے دوسرے دلکش موضوعات پر نظمیں لکھنے کا رواج ہوا۔ ظاہر ہے، نئے شاعروں نے ہوا کے اس بدلتے ہوئے رخ کو دیکھا، پسند کیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال کا اسے بہتر ذریعہ پایا، اور بہت سے لوگوں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ بلاشبہ اس وقت تک غزل سب کے مزاج پر حاوی تھی اور روایت پسند لوگوں کا اس تبدیلی کو بہت جلد اختیار کرنا آسان نہیں تھا۔ اس لئے غزل گو شعراء اس پورے منظر کو توجہ اور سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے، مثلاً شادؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، یگانہؔ جیسے بہت سے شعراء نے اپنی ترجیحات غزل ہی کے ساتھ وابستہ رکھیں۔

جن شعراء نے آزادؔ اور حالیؔ کی پیروی میں نظم کو اختیار کیا اور اسے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ان میں اسمٰعیلؔ میرٹھی، شبلی نعمانیؔ، شوقؔ قدوائی، وحیدؔ الدین سلیم، نظم طباطبائیؔ، سرور جہاںؔ آبادی، نادر کاکوروی، چکبست اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کے نام خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شاعروں نے زیادہ تر ایسے موضوعات پر نظمیں لکھنا پسند کیا جن سے ایک طرف قوم کی اخلاقی اصلاح ہو سکے تو دوسری طرف یہ شاعری عام لوگوں میں قومی اخوت و محبت کا جذبہ بھی پیدا کر سکے، یا پھر ایسی نظمیں لکھی گئیں جن میں مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی

عکاسی کی گئی تھی۔ یہ پورا دور عمومی طور پر موضوعاتی شاعری کا دور تھا، ان میں بہت سے شاعروں نے مغربی شاعری کے شہ پاروں کے منظوم ترجمے بھی کئے۔ اس سلسلے میں نظم طباطبائی کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے، جنھوں نے گرے کی ایلیجی کا منظوم ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے عنوان سے کیا، اس کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد صنفِ نظم میں افکار و خیالات کے تنوع کے ساتھ ساتھ فنی نیرنگیوں کا بھرپور اظہار کیا گیا۔ اس پس منظر میں سیماب اکبرآبادی کی شاعری پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور ابتداء میں میرؔ و غالبؔ کی پیروی کی کوشش کی اور اپنی غزلوں کو انھیں بنیادوں پر استوار کیا، لیکن تقلید کی اس روش پر بہت دن قائم رہنے کے مقابلے میں اپنی شاعری کو موضوعی اور فکری اعتبار سے تنوع اور تلون سے آشنا کیا جس کے نتیجے میں ان کی شاعری اپنے ماقبل و مابعد کی شاعری سے مختلف و ممتاز ہوتی گئی۔ زمانے کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سیماب نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اور چونکہ ان کے اردگرد کا ماحول نظم گوئی کا تھا، اور وہ خود بہت باصلاحیت اور ذی استعداد شخص تھے، اس لئے وہ بھی بہت جلد اچھی نظمیں لکھنے لگے۔ سیماب کی ان نظموں کے موضوعات میں مذہبی، سماجی، سیاسی، اخلاقی، اصلاحی اور ادبی ہر قسم کے موضوعات شامل تھے۔ انھوں نے ایک خاص منزل پر آکر غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دی۔ کلیمِ عجم کے ایک خطبہ میں انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ:

''نظم غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنفِ کلام ہے۔'' [۱]

سیماب ایک فطری شاعر تھے، تخیل و وجدان ان کے رہنما تھے۔ فن شعر، عروض،

۱۔ کلیمِ عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۱۲۱

بیان و بدیع پر انھیں زبردست قدرت حاصل تھی۔ وہ جس بات کو جس ہیئت میں جتنے مؤثر انداز میں کہنا چاہتے، کہہ دیتے، چنانچہ ہیئت اور صنف کا انتخاب سیماب کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے غزل، نظم اور رباعی وغیرہ کے توسط سے انھوں نے اپنے جذبات و خیالات کو بآسانی و بے تکان پیش کیا ہے اور حسب ضرورت اوزان و بحور میں بھی وہ جزوی تبدیلی کر لیتے تھے۔ شعر کی بلندی، طرزِ بیان کی پختگی اور غیر معمولی اثر انگیزی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے اپنے خطبات ''کلیمِ عجم'' میں بھی اپنے فکر و فن پر بہت واضح طور پر روشنی ڈالی ہے جس کی مثالیں آئندہ اوراق میں حسب ضرورت پیش کی جائیں گی۔

سیماب اپنے عہد تک کی شاعری پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ نئی شاعری حقیقت پسندانہ ہو تا کہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور سماج میں تعمیری انقلاب کا سبب بن سکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ:

> ''حقیقی شاعری وہی شاعری ہے جو ہماری روح کو جھنجوڑ دے، ہمارے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے اور ہمارے دماغ کو اپنے اثرات سے متکیف کر کے ہمیں سرخوشی و بے خودی کا اہل بنا دے۔''[1]

اپنے دوسرے خطبے میں محض تصوراتی شاعری کے مقابلے میں شاعری کے زمینی اور حقیقت پسندانہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

> ''اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا، اب مجازی

۱۔ کلیمِ عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۱۵۳

جذبات وصل وفراق کی نقالی کا موقع نہیں ہے۔ حقیقی موضوعات
اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ
ہونے کی مہلت بھی نہیں ملنی چاہئے۔''[1]

سیماب کے یہ افکار بہت بلند اور ولولہ انگیز تھے۔ اسی لئے انھوں نے شاعری کو نت نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ انھوں نے بہت لکھا، ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے متعدد مجموعے ان کے شاعرانہ کمال کی عمدہ مثال ہیں۔

''نے ستاں''

سیماب کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں ''نے ستاں''، ''کارامروز''، اور ''ساز وآہنگ''۔ ان میں پہلا مجموعہ ''نے ستاں'' ہے۔ اس کی اشاعت ادارۂ قصرالادب، آگرہ سے نومبر ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ اس مجموعہ میں ۵۸ نظمیں شامل ہیں، جن کو (۱) حجازیات (۲) اسرار (۳) محمل اور (۴) جنت کے خطوط کے زیرعنوان تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ پورا مجموعہ سیماب کی مذہبی سرشاری کا مظہر اور جذباتیت سے معمور ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے محبت، رسول کریم ﷺ سے عشق، خلفائے راشدین، اصحاب، اہل بیت اور دیگر صحابہ کرام سے عقیدت ومحبت ہر ہر گوشے سے جھلکتی ہے۔ البتہ تاریخ اسلام اور مذہبیات سے انھیں خصوصی شغف تھا۔

سیماب عربی اور فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ بہت سے فارسی شعراء کا کلام تو انھیں مستحضر تھا اور خود بھی فارسی میں بہت اچھے شعر اور تضمینیں کہتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا

۱۔ کلیمِ عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۳۸

اور ان کے پاس الفاظ کا خزانہ بھی زبردست تھا۔ الفاظ کے استعمال پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اسی طرح نئی نئی تراکیب کی اختراع پر بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہو یا رسول اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گلہائے عقیدت نچھاور کرنے کا موقع، وہ مسلسل ومتواتر صفات اور مترادفات پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''ترانۂ وحدت'' کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

یہ شمس و قمر یہ ارض و سما، سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر رنگ میں ہے ترا جلوہ، سبحان اللہ سبحان اللہ
جلوے تیرے گلشن گلشن، سطوت تیری صحرا صحرا
رحمت تیری دریا دریا، سبحان اللہ سبحان اللہ
معمور ترے ہی نور سے ہے پرنور ترے ہی نور سے ہے
کونہ کونہ چپہ چپہ، سبحان اللہ سبحان اللہ
وہ نشہ خمار الفت کا، وہ جام مئے انسیت کا
وہ کیف شرابِ محبت کا، سبحان اللہ سبحان اللہ

سیماب جس طرح خدا کی حمد و ثنا سے سرشار نظر آتے ہیں، اسی طرح جب رسول خدا ﷺ کی نعت پاک لکھنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے عشق میں سرشاری و استغراق کی کیفیت میں آجاتے ہیں۔ ''خورشید رسالت'' کے عنوان سے پیش کردہ نظم میں مسلسل صفحات میں، پے در پے تراکیب لاتے ہیں اور فارسی و اردو کے جن شعرا نے نعتیہ قصائد لکھے ہیں ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ''خورشید رسالت'' سے صرف تین بند یہاں پیش ہیں:

آئے جناب مصطفیٰ، ان پہ درود و سلام　　آیۂ رحمتِ خدا، ان پہ درود و سلام
خاتمِ جملہ انبیا، ان پہ درود و سلام　　ان پہ صلوٰۃِ دائمہ، ان پہ درود و سلام
صلِ علےٰ مُحمدؐ، صلِ علےٰ محمدؐ

قطرہ ہے بحرِ کائنات اس کے یم وجود کا　　ذرہ ہے بزم دوجہاں، آبروئے شہود کا
مژدۂ بخششِ گناہ، فیض ہے اس کے وجود کا　　اُمتیانِ مصطفیٰ وقت ہے یہ درود کا
صلِ علےٰ مُحمد، صلِ علےٰ محمدؐ

چشم کلیم سے کہو دعوتِ حسن و نور ہے　　مکہ کی ہر گلی غیرتِ کوہِ طور ہے
دیکھ لیں اہلِ دل اگر دیکھنے کا شعور ہے　　بہر زیارتِ نبی پاس ادب ضرور ہے
صلِ علےٰ مُحمدؐ، صلِ علےٰ محمدؐ

سیماب کے یہ اشعار عشقِ رسول ﷺ کے جذبہ سے سرشار ہیں اور ان کے پڑھنے سے قاری پر ایک وجدانی وانبساطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

''نے ستاں'' میں حجازیات کے تحت جو نظمیں شامل ہیں ان میں ترانۂ وحدت، خورشید رسالت، مکہ کی ایک صبح، اے وہ کہ تو سب کچھ ہے، عرضِ بیداری، استغاثہ (دربارِ رسولؐ میں)، گھٹا مدینے سے، گنبدِ رسول سے، پھولوں کی چادر، طواف کعبہ اور اے قافلے والو، سے شاعر کے دل کی کیفیات، روح کی پاکیزگی، جذبات کی بلندی اور بیان کی بے ساختگی قدم قدم پر عیاں ہیں۔ ایک مومن کے اندر رسول اکرم ﷺ، اہل بیت کرام اور صحابہ کرام سے جس قدر محبت ہونی چاہئے، سیماب کی مذکورہ نظمیں اس کی بہترین مظہر ہیں۔ سیماب نے الفاظ کے انتخاب میں بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ ان کی تراکیب اور بندش الفاظ، شستگی اور شائستگی سے معمور ہیں۔ سیماب کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ ان مقدس خیالات

کی ادائیگی کے لئے الفاظ بھی پاکیزہ اور مقدس ہونے چاہئیں، اس لئے حجازیات کی تمام نظموں میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا ہے اور ہر نظم پاکیزگی میں طاق ہے۔ نظم ''مکہ کی ایک صبح'' میں ان کی فصاحت و بلاغت کی عمدہ مثالیں موجود ہیں:

ناگہاں پیدا ہوئے عالم میں آثار سحر　　مشرقِ طلعت پر گھر کر آئے انوارِ سحر
مطلع ظلمت پہ چھایا رنگِ بیدار سحر　　آمدِ خورشید کی لایا خبر تارِ سحر
ایک چشم منتظر تھا، صبح کا تارا نہ تھا

مشرق طائف کی فطرت میں جو آیا انقلاب　　جلوہ گر سورج ہوا اک اور قبلِ آفتاب
بے عدیل و بے مثال و بے نظیر و لاجواب　　مجتبیٰ، بدرالدجیٰ، شمس الضحیٰ گردوں جناب
آفتاب اس کے رخ پر نور کا پروانہ تھا

پھر تو مکہ کیا، زمانے میں اجالا ہوگیا　　رات کا منہ نور کی کثرت سے اجالا ہوگیا
مطلع عالم کا چہرہ حسن والا ہوگیا　　لیجئے شمس الضحیٰ کا بول بالا ہوگیا
اس کی ضوئے حسن سے آباد ہر ویرانہ تھا

سیماب کو اس جذب و کیفیت کے عالم میں بھی اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا خیال رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو سراپا تقصیر، برباد اور رسوا ظاہر کر کے بارگاہِ ایزدی اور دربارِ رسول میں استغاثہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ''اے وہ کہ تو سب کچھ ہے'' میں رسول اکرم ﷺ سے یوں مخاطب ہیں:

محتاج ہیں مضطر ہیں، اے گیسوؤں والے ہم　　بے ہم دم و یار ہیں، اے گیسوؤں والے ہم
آوارہ ہیں ابتر ہیں اے گیسوؤں والے ہم　　بھولے ہوئے تجھ پر ہیں اے گیسوؤں والے ہم
اے وہ کہ تو سب کچھ ہے!

امید کے دریا میں، طوفان سا برپا ہے　　موجوں کا تلاطم ہے، کشتی ہے نہ بیڑا ہے
بدلا ہوا رخ ہم سے دنیا کی ہوا کا ہے　　ادبار میں آفت ہے، منجدھار میں نیّا ہے
اے وہ کہ تو سب کچھ ہے!

ایک اور دوسری نظم میں بھی سیماب بارگاہِ رسول میں استغاثہ پیش کرتے ہیں۔

یا نبی اب تو ہو لِلّٰہ عنایت کی نظر　　بڑھ چکی حد سے زیادہ خلش زخم جگر
حال یہ ہے کہ ہوا دہر میں جینا دوبھر　　قوت ضبط ہے امکانِ سکون سے باہر
کشمکش رنگ انوکھا کوئی لائے نہ کہیں
دلِ بے تاب تڑپ کر نکل آئے نہ کہیں

ابتدائی دور کی نظموں میں سیماب کا مذہب سے لگاؤ ایک پختہ عقیدت مند کی طرح زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور انھیں اس بات کا یقین کامل ہے کہ سرکار دو عالم شافع محشر ہیں اور روزِ محشر ان کی شفاعت کریں گے۔ یہی یقین اور محبت کا اثر ان کی نظم ''پھولوں کی چادر میں'' میں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے مزارِ رسول کے لئے پھولوں کی جس چادر کی تمنا کی تھی وہ ان کی عقیدت و محبت و احترام کی شاہد ہے۔

چادرِ گلگوں چڑھا کر مرقدِ سرکار پر　　میں تیرا افسانہ لاؤں گا لب اظہار پر
تیرے پھولوں سے جو پیدا ہوگی بوئے بیکسی　　حال ہوگا ترا ظاہر سیّد ابرار پر
ان کے اوراق پریشان سے ٹپک نکلے گی یاس　　رنگ چھا جائے گا قبر احمد مختار پر
دیکھ کر یہ حال یہ رنگ اور یہ کیفیتیں　　پڑ ہی جائیں گی نگاہیں چادرِ گلنار پر
چشم خواب آگیں مگر، باصد حجاب آید برون
نرگس مخمور شاید از نقاب آید برون

''پھولوں کی چادر مزار رسول کے لئے'' میں انھوں نے پہلے اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری اور زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ پھر رسول اکرم ﷺ کے فیض و شفقت کا بیان کیا

ہے۔ ہر مومن کی طرح سیماب کا بھی جذبۂ ایمانی تازہ اور پختہ ہے۔ چونکہ وہ بھی طواف کعبہ کا اشتیاق رکھتے ہیں اور مدینہ منورہ کی زیارت کے متمنی ہیں اس لئے طوافِ کعبہ، اے قافلہ والو، سن او جہاز ران، ہوازن اور جنت البقیع وغیرہ نظموں میں وہ عشق رسول میں اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کیفیت سے قاری کو بھی ایمان و ایقان کی روشنی ملتی ہے۔ مزید برآں اسی جوش قلب کے ساتھ ساتھ شاعرانہ لطافت و مہارت نے نظم میں زبردست دلکشی پیدا کر دی ہے۔

سیماب نے اس دور میں ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو اسلام کے ابتدائی زمانے کے واقعات اور صحابہ کرام کے اعلیٰ کارناموں پر مشتمل ہیں۔ ان نظموں کی تخلیق کا مقصد اُن بزرگوں کی عظمت کا احساس دلانا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان سے محبت کے جذبات پیدا ہوں اور ان کے اندر اسوۂ حسنہ کو پروان چڑھایا جا سکے۔ اس زمرہ میں ان کی نظمیں اسوۂ رسول، اصلاح الاعمال، خدیجۃ الکبریٰ، ایثار بتول، استغناء زہرا اور بلال وغیرہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

ان نظموں میں سیماب نے اسلام کی برگزیدہ ہستیوں کے اخلاق حسنہ حلم و مروت، ایثار و قربانی کے مثالی نمونے پیش کر کے ان اوصاف کو اپنی زندگیوں میں ڈھالنے کی تلقین کی ہے، تاکہ ان کی تالیف قلوب ہو سکے۔ نظم اسوۂ رسول میں اس دور کی حق گوئی اور پاک بازی کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ حق و انصاف کی ایک عمدہ مثال وہاں بھی نظر آتی ہے جب مسلمان مالِ غنیمت کے حصے کی تقسیم کے سلسلے میں اختلاف اور غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے جب انصاف کیا تو تمام اختلاف ختم ہو کر ان میں اتحاد و اتفاق ہو گیا۔ یہ سب واقعات سیماب کے عشق رسول و اہل بیت و صحابہ کرام سے محبت اور اس میں سرشاری کے واضح ثبوت ہیں۔ اس نظم سے یہاں چند اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں:

حضور کہتے تھے جو بات اس جماعت سے　　صدا نکلتی تھی آمنّا اور صدقنّا
وہ لوگ کہنے لگے ہاں خدا اور اس کا رسول　　ہے سب سے بڑھ کے ہمارے لئے مضر ما
یہ سن کے آپ نے ان سے بزور فرمایا　　یہ بات تم نہ کہو، بلکہ یوں کہو بابا
کہ اے محمد اسی وقت ہم نے کی تصدیق　　تجھے جو لوگوں نے دنیا میں آ کے جھٹلایا
کہ اے محمد اسی دم پناہ دی تجھ کو　　جو تجھ کو چھوڑ کے لوگوں نے بغض تجھ سے کیا
مگر ذرا یہ بتائیں تو معشر انصار　　کہ کیا پسند نہیں ان کو فیصلہ ایسا
کہ لوگ بکریاں، اونٹ اور سیم و زر لے جائیں　　وہ اپنے گھر میں محمد کو لے کے جائیں بھلا
یہ سن کر چیخ اٹھے جتنے جمع تھے انصار　　کہا کہ ہم کو تو درکار ہے رسولِ خدا
بہت سے روئے کچھ ایسے کہ تر ہوئی داڑھی　　تڑپ تڑپ کے بہت سے ہوئے نثار و فدا

کسی کو جذب تھا اور مست ہو رہا تھا کوئی
زبانِ حال سے کوئی یہ نظم پڑھتا تھا

اسی طرح کے اشارے ان کی دوسری نظم ''اصلاح الاعمال'' میں بھی کئے گئے ہیں، جس سے نظم میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ سیماب کی نظم ''رودادِ بیداد'' اور ''فریاد'' اقبالؔ کے ''شکوہ'' اور حالیؔ کی ''مدوجزرِ اسلام'' کے رنگ میں لکھی ہوئی ہیں۔ جس میں سیماب نے اقبالؔ کی طرح خدا سے بے باکی کے برخلاف بارگاہِ ایزدی میں نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور انھیں اس سے نکالنے کی التجا کی ہے۔ نظم بیداد کی ابتداء انھوں نے بہت عجز و انکساری و رضائے کامل میں عبودیت کے لہجے میں کی ہے اور اسی طرح کے اظہار مندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں: ''نظم بیداد کی ابتداء ہی میں خدا کی بارگاہ سے کوثر میں

نہائی ہوئی، لطیف، پاکیزہ، دردہائے مضامین اور انوار کے موتی رولنے والی زبان کی تمنا کی ہے۔ بارگاہ لم یزل میں ان کے التماس کو شرفِ باریابی ملا اور ان کی غنچہ دہنی گل صد برگ بن کر شعلہ فشاں ہوگئی ہے۔''[۱] روداد بیداد سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ضبط کو ہے یہ گلہ دیکھ کے خاموش مجھے　　لبِ ساکت نے کیا مانع صد جوش مجھے
کردیا نطقِ حقیقت نے فراموش مجھے　　تھی زباں منہ میں کبھی یہ بھی نہیں ہوش مجھے

ہوئی تقسیم کہیں نالہ فشانی میری
زنگ آلود ہے اب سیف بیانی میری

یا نبی سچ تو یہ ہے جان سے بیزار ہیں ہم　　کوئی یاور ہی نہیں بیکس و لاچار ہیں ہم
ہاں گنہگار ہیں ہم سخت گنہگار ہیں ہم　　آپ سے اب تو معافی کے طلب گار ہیں ہم

عاصیانیم بہ امّیدِ کرم آمدہ ایم
لطف کن پامالِ ستم آمدہ ایم

ہائے اسلام کا اب کوئی سہارا نہ رہا　　صبر کی خوب کہی! صبر کا یارا نہ رہا
بیچ میں آگئے ہم پاس کنارا نہ رہا　　جو خدا سب کا تھا کیا اب وہ ہمارا نہ رہا

بیقراروں کو اثر وقت دعا بھول گیا
اب تو کہنے دو کہ بندوں کو خدا بھول گیا

دونوں شعر کے اسلوب اور لہجے میں مماثلت کے ثبوت میں اقبالؔ کے شکوہ کا صرف ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور　　نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

۱۔　سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، ص ۵۵

قہر تو یہ کہ کافر کو ملیں حور و قصور　　اور بے چارے مسلمان کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں

بات یہ کیا کہ پہلی سی مدارات نہیں

جیسا کہ عرض کیا گیا، سیماب نے نظم ''رودادِ بیداد'' میں جہاں ایک طرف شعلہ بیانی کی ہے تو وہیں دوسری طرف بھرپور انکسار کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ چونکہ جہاں اللہ رب العزت سے شکوہ کرتے ہیں وہیں آہ وزاری بھی کرتے ہیں اور رسالت مآب حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں دست بستہ ادب واحترام سے درخواست گزار بھی ہیں جس میں ان کی نگاہیں فرطِ ادب سے جھک جاتی ہیں۔ مثلاً

یا نبی وقتِ بد آیا ہے مسلمانوں پر　　جو ہوئی دیر تو بن جائے گی اب جانوں پر

ہو چکا قبضۂ اغیار خدا خانوں پر　　نظرِ رحم، کہ بات آگئی ایمانوں پر

ہوا ایمان کو نقصان تو ہے نقصان کی بات

جان سے بڑھ کے ہے ایمان یہ ہے ایمان کی بات

منقولہ بالا اشعار میں سیماب نے اظہار کا جو رنگ اختیار کیا ہے، ذیل کے اشعار میں وہ اس سے مختلف انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہاں حسبِ موقع ملائمیت کو برتا گیا ہے:

ہاں خدا کے لئے غم خوار غریباں ہونا　　کہ ابھی درد کا آسان ہے درماں ہونا

تھا نصیبوں میں شکارِ غم پنہاں ہونا　　کیا بڑی بات ہے تسکین کا ساماں ہونا

نظر لطف غریبوں پہ اگر ہو جائے

شب تاریک مصیبت کی سحر ہو جائے

سیماب کا اپنے مدعا کو طلب کرنے کا انداز ایسا ہے کہ خدائے لم یزل کی رحمت جوش میں آجائے۔ نظم ''فریاد'' اسی جذب وسلوک کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے اس نظم میں

رحمۃ للعالمین کی بارگاہ میں فریاد کی ہے۔ڈاکٹر زرینہ ثانی کے الفاظ میں:

''اقبال کی نظم شکوہ، سیماب کی فریاد اور آغا حشر کی شکایت ایک ہی زمانے کی لکھی ہوئی تھیں، تینوں نظموں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ان نظموں کو اس دور کے مسلمان رو رو کر پڑھتے تھے۔انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں اتنی اثر انگیز نظمیں لکھیں جو کہ شعریت سے لبریز ہیں'' [۱]

نظم ''فریاد'' سے یہ بند ملاحظہ ہو:

داد منظور نہیں قابل بیداد ہوں میں　　خوگر داد ہوں آزردۂ افتاد ہوں میں
اپنی ملّت کے لئے خستہ و ناشاد ہوں میں　　اک بڑی بات سے آمادۂ فریاد ہوں میں
وہ جسے دردِ محبت کی دوا کہتے ہیں
ہاں خدا تو نہیں محبوبِ خدا کہتے ہیں

نظم ''فریاد'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیماب کے دل میں احساسات و جذبات کا سیلاب امڈا چلا آیا ہے۔قوم کے لئے درد وغم، کرب وخلش نظم میں پوری طرح نمایاں ہے، جس کو پڑھ کر عجیب کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔لیکن اس سب کے باوجود اندازِ بیان بے حد دلکش ومؤثر ہے۔

پہلے ہم صاحبِ اورنگ تھے اور مالکِ تاج　　آہ! اک ناں جویں کے لئے بیتاب ہیں آج
نہ حکومت ہے نہ ثروت ہے نہ دولت ہے نہ راج　　اس سے پہلے تو نہ تھے ہم کبھی ایسے محتاج
گوہر ولعل سے مملو تھا خزانہ اپنا
ہائے وہ دن کہ موافق تھا زمانہ اپنا

۱۔　سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۵۷

آہ! آبادیٔ اسلام کی بربادی ہے　　جو ستم کیش ہے، آمادۂ جلادی ہے
جاں شکن غیر کی طرزِ ستم ایجادی ہے　　تنِ مجروح لبِ زخم سے فریادی ہے

یادگارِ ز وفاداریٔ بسمل باقی ست
قطرۂ خون بسرِ دامن قاتل باقی ست

اسی نظم میں سیماب نے رسالت مآب کے حضور میں بڑی اضطرابی قلب سے دعا مانگی ہیں:

تو ہو پیدا، تو کوئی شکل ظفر ہو پیدا　　مردہ اجسام میں ہستی کا اثر ہو پیدا
پھر ہر اک جسم میں اعجاز سے سر ہو پیدا　　عالمِ حال میں دنیائے دگر ہو پیدا

یہ جو زندہ ہیں تو اسلام بھی زندہ ہو جائے
ٹھوکریں کھا کے ہر اک نفس مسیحا ہو جائے

''نے ستاں'' کی دیگر نظموں میں طور کی چوٹی، عرفانِ نفس، جلال و جمال، دعوتِ روح، ہمہ اوست تو ہی ہے، ڈھکوری کا محویت خانہ وغیرہ شامل ہیں۔ جس میں ان کے خیال کی گہرائی و گیرائی نمایاں ہیں۔ ان فلسفیانہ مضامین سے معمور متصوفانہ الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات پر مبنی نظموں کے مطالعہ سے سیماب کے تخیل کی گہرائی، فکر کی بلندی، مطالعۂ کائنات پر دست رس اور زبان و طرز ادا کی کثیر جہتی و تاثیر کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

''ڈھکوری کا محویت خانہ'' سیماب کی ایک تمثیلی نظم ہے۔ اس میں استعاروں اور کنایوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ یہ بہت دلکش اور مؤثر نظم ہے۔ اس کے بارے میں خود سیماب ''نے ستاں'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ڈھکوری ایک چھوٹا سا پردار جانور ہوتا ہے۔ اسے ہر وقت جھینگر

کی تلاش رہتی ہے۔ جب جھینگر کسی سوراخ میں مل جاتا ہے تو
اسے پنجوں میں دبا کر اپنے گھر لے جاتی ہے اور وہاں اسے اپنے
سامنے رکھ کر اس پر اپنا تصور جماتی ہے اور ایسی محوِ تصور ہو جاتی
ہے کہ خود فنا ہو جاتی ہے اور پھر جھینگر ڈھکوری بن کر جھینگر کی تلاش
میں پھرنے لگتا ہے۔'' [1]

اسی حالت سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی گئی ہے۔ اس نظم کے ذریعہ خود سیماب نے خالقِ حقیقی کی طرف رجوع کیا ہے اور اہل تصوف کو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ڈوب جانے کی تلقین کی ہے۔ ایک بند میں ڈھکوری سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اپنی ہستی کو مٹانا کوئی تجھ سے سیکھ لے — قالب دلبر میں آنا کوئی تجھ سے سیکھ لے
ہے تجھے صد آفرین اے قطرہ لرزانِ عشق — گھل کے دریا میں سمانا کوئی تجھ سے سیکھ لے
جزو کے کل میں سما جانے کی یہ ترتیب ہے — اس طرح مٹنا مٹانا کوئی تجھ سے سیکھ لے
ہے فنا ہونا ترا حسنِ بقا کی ایک مثال — زندگی مر مر کے پانا کوئی تجھ سے سیکھ لے

یہ فنا اور یہ بقا ہست و عدم کا ہے ثبوت
''مثلِ سبزہ بار رہا روئیدہ ام'' کا ہے ثبوت

سیماب نے اس نظم کے توسط سے زندگی کو جاودانی، دل کو حسن جاناں کا جلوہ خانہ اور خودی سے بے خودی، احساس نفس یا تعین ذات اور خود آگہی کے اعلیٰ وارفع تصورات کو پیش کیا ہے۔ ان کا یہی تصورِ خودی ان کی بے پناہ رجائیت، امید آفرینی اور خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ جدید دور کے آشفتہ حال اور شکست خوردہ انسان کو یہ احساس

۱۔ نے ستاں، سیماب اکبر آبادی، ص ۹۰

دلانا چاہتے ہیں کہ:

اس طرح اے ڈھونڈنے والے تلاش یار کر　　نذرِ وحشت زندگی اپنی نہ تو زنہار کر
ہے یہ تیری زندگیٔ جاودانی کا سبب　　یا زمین ہوجا فنا، اپنی خود کو مار کر
اپنے ہونے کا نہ تجھ کو کسی صورت گمان　　چور اپنے ہاتھ سے خود شیشۂ پندار کر
محو ہو اتنا تصور میں کہ ہوجائے فنا　　دیدۂ باطن سے حاصل لذتِ دیدار کر

''ماسوا'' سے ہو منزہ محویت خانہ تیرا
حسرت جاناں میں ہو انداز جانا نہ ترا

اس نظم میں تلاش وجستجو کو خودی و بے خودی کی زندگیٔ جاودانی قرار دیا گیا ہے۔ اقبالؔ کی طرح سیماب نے بھی محسوس کیا کہ انسانوں میں حرکت وعمل کے جذبے کے احیاء کے لئے خودی کو بیدار کرنا ضروری ہے۔ اسی سے بزرگان دین اپنی منزل مقصود پاتے رہے ہیں۔ سیماب کی ایک دوسری نظم، جو ''بلبل اسیر'' کے عنوان سے ہے، وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔ جس میں تماش بین بلبل سے مخاطب ہوکر قفس کو توڑنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن بلبل کا رویہ اس کے برخلاف ہے۔ اس کو تو ضبط وتحمل ہی میں مزہ آتا ہے۔ اسی لئے وہ تماش بین سے کہتا ہے کہ:

گلستان نزدیک تر ہے خانۂ صیاد سے　　ہیں جوانانِ چمن مصروف خوابِ ناز میں
میں قیامت کیوں بپا کروں لبِ فریاد سے　　آگ پھولوں میں لگادوں سوز بھردوں ساز میں
نالہ آسان ہے مگر مشکل ہے ضبطِ آرزو　　ضبط سے مایوس ہوجاؤں تو پھر نالہ کروں
ضبط اک بجلی ہے خرمن کی ہے جس کو جستجو　　وقت آجائے تو گلشن کو تہ و بالا کروں

نظم ''بلبل اسیر'' مکالماتی انداز لئے ہوئے ہے۔ سیماب نے تماشائی سے بلبل کے مکالمہ کی شکل دی ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان کو خودشناسی کا تصور احساس دلایا ہے جو ایک حساس شاعر کا پیغام حیات ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عہد جدید کے پریشان حال

اور شکست خوردہ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں پنہاں خودشناسی، معرفت نفس اور قوت عمل سے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں اس دور کی بہت سی قابلِ ذکر اور دلچسپ نظمیں ہیں جن میں سیماب کی شخصیت کے دیگر پہلو بھی آشکار ہوتے ہیں۔ ان نظموں میں انسانی جذبات و احساسات میں جذبۂ محبت سب سے بلند نظر آتا ہے۔ شاعر کو ایسے حسن کی عکاسی میں مہارت حاصل ہے۔ اس نے حسن کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے کہ اس کی رعنائیاں آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ نمودِ حسن، پرستارہ، استعفائے محبت، ارضِ تاج، پیام آرزو وغیرہ اس کی بہترین مثال ہیں۔

سیماب کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں روحانی تصورات و کیفیات کی بھی کمی نہیں ہے، البتہ یہ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ ان کے یہاں عشق و محبت کے جذبہ کا اظہار روایتی نہیں ہے۔ اس لئے نظم ''استعفائے محبت'' میں اس خیال کو انھوں نے بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے اس نظم کا آغاز وفا کے تذکرے سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تمہیں وفا سمجھ کر دل غمزدہ دیا تھا　　نہ تھا شکوۂ تغافل نہ مجھے کوئی گلہ تھا
جو روا رکھی ہے اب یہ نگۂ عتاب تم نے　　تو کیا ہی کیوں تھا پہلے مجھے کامیاب تم نے
نہ وفا کا عہد کرتے نہ مرا یہ حال ہوتا　　نہ تمہیں خیال ہوتا، نہ مجھے خیال ہوتا

لیکن سیماب نے نظم میں وفائے محبت کے خیال کے ساتھ ساتھ محبوب کی بے التفاتی کا بھی گلہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ؎

یہ سلوکِ دوستی ہے تو سلام دوستی کو

سیماب کہتے ہیں کہ محبوب کے در پر مسلسل عجز وانکسار جائز نہیں ہے۔محبوب کے دل میں بھی تو محبت کا چراغ روشن ہو،جس سے عاشق کی خودداری جھلکتی ہے۔مثلاً کہتے ہیں:

تم اس کو سرخرو کرو تو آبروئے عشق ہے　　یہ حسرت ہوس نہیں، یہ آرزوئے عشق ہے

وفا کا عہد کہتے ہیں کہ دست ودل کا ساتھ ہے　　خموش کیوں ہو کہہ بھی دو یہ دل ہے اور یہ ہاتھ ہے

تمہیں یہ فخر ہو کہ حسن دل نواز ہو گیا

مجھے یہ ناز ہو کہ میں اسیرِ ناز ہو گیا

''نے ستاں'' کی بعض نظمیں جشنِ سلطانی (ایک مہجور کی نگاہ سے)، دوشیزۂ بہار، نسیم برشگال، عرض تجلی، جوش انتقام، ذروں کا مستقبل وغیرہ ایسی ہیں، جن میں سیماب کی شاعری اور نظم نگاری کا ارتقاء صاف نظر آتا ہے۔مثلاً نظم جشنِ سلطانی میں شاعر نے ایک مفلس کے جذبات واحساسات کی تصویر کشی کی ہے جس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دکھ اور تکلیف کے دور سے وہ گزر رہا ہے جذباتی طور پر سیماب اس سے وابستہ ہو گئے ہیں اور اس کی ہر تکلیف، ہر درد سیماب کا درد معلوم ہونے لگا ہے جس کی وجہ سے نظم میں بہت زیادہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

اس مجموعہ کے بالکل آخری حصے میں جنت کے خطوط والی چھ نظموں کا حصہ بالکل منفرد اور بے مثال ہے۔اس میں سیماب نے انسانی فطرت کے نشیب وفراز سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔موضوع بھی بالکل نیا اور اندازِ بیان بھی انوکھا ہے جس میں پہلا خط صغرسن بچے کی طرف سے اپنے باپ کے نام، دوسرا خط ایک معصوم بچی کی طرف سے ماں کے نام، تیسرا ماں کی طرف سے بچوں کے نام، چوتھا خط باپ کی طرف سے بچوں کے نام، پانچواں بیوی کی طرف سے شوہر کے نام اور چھٹا خط شوہر کی طرف سے بیوی کے نام لکھے

گئے ہیں۔ یہ تمام خطوط انسانی جذبات واحساسات کے اظہار سے لبریز ہیں۔ ان میں مختلف لوگوں کے انتقال سے ان کے قریب ترین متعلقین پر جو کچھ گزرتی ہے، اس کا احساس کرتے ہوئے انھیں بہت خوبصورت اور اثر انگیز انداز میں صبر کی تلقین کی گئی ہے:

روتے ہو ابا رات دن ناحق مجھے دفنا کے تم — کرتے ہو کیوں آہ وفغاں مری لحد پر آ کے تم
ابا جدا ندوہ گیں اماں الگ بے آس ہیں — آخر یہ مایوسی کیوں ہم خدا کے پاس ہیں
اپنی امانت تھا، تمہیں اللہ نے مجھ کو دیا — میں تو اسی کا مال تھا جب چاہا اس نے لے لیا
بے سود آہ وزاریاں، بے فائدہ یہ شور ہے — قسمت پہ کس کا جبر ہے قدرت پہ کس کا زور ہے

سیماب نے اس نظم میں بچوں کی موت پر عام لوگوں کو صبر وتحمل کی تلقین کی ہے۔ وہ اس طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں صبر وشکر کرنا چاہئے۔

اس کے برخلاف جب وہ والدین کے انتقال سے بچوں کو پہنچنے والے صدمے کا احساس نظم کرتے ہیں تو ان کے الفاظ بھاری بھرکم، خیالات میں عمر کی پختگی اور تجربات کا نچوڑ اور اثر انگیزی میں انفرادیت موجود ہے۔ مثلاً ماں کے انتقال پر اس کے بچوں کے لئے اس کے بھی جذبات کا اظہار کراتے ہیں:

یہ ہماری زندگی کا تھا حصول پیارے بچو — کیا پرورش اٹھا کر غم صد ہزار تم کو
تمہیں تربیت دلائی، تمہیں آدمی بنایا — جو نہ آتا تھا بتایا، جو نہ یاد تھا اس کو سکھایا
نہ رہا غرض ادھورا کوئی اور کام باقی — فقط اک اجل رہی تھی بے انصرام باقی
جسے کہتے ہیں قضا سب وہ کمال زندگی ہے — اسے کیا سمجھ رہے ہو یہ مآلِ زندگی ہے

اسی طرح ایک خط میں اپنے انتقال کے بعد بچوں سے باپ ان توقعات کا اظہار کر رہا ہے۔

ہماری ہستیٔ رفتہ کی یادگار ہو تم — ہمارے گلشنِ امید کی بہار ہو تم

ہماری خاک سے اٹھا ہوا غبار ہو تم　　یہ کہہ رہی ہیں امیدیں کہ ہونہار ہو تم

ہمارا نام ہے دنیا میں بیش و کم باقی

تمھارے دم سے ہیں گویا جہاں میں ہم باقی

اور پھر وہ انھیں یہ نصیحت کرتا نظر آتا ہے:

ہمارا نام نہ تم خاک میں ملا دینا　　تم آبرو نہ ہماری کہیں مٹا دینا

ہماری محنتِ مرحوم کا صلا دینا　　تمھارے ہاتھ ہمارا ہے اب جلا دینا

کہ مرنے والا ہے زندہ جو نام زندہ ہے

جیئے جو بعد فنا وہ مدام زندہ ہے

سیماب کی ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کے گہرے شناسا ہیں۔ بچوں کے جذبات و خیالات، ماں باپ کے احساسات، شوہر اور بیوی کے جذبات وغیرہ کا بیان ان کے گہرے مشاہدے کا عکس ہیں۔ خاص طور سے بیوی کا خط بڑا ہی المناک ہے۔ جس میں انھوں نے مرد اور عورت کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

گزشتہ سطور سے یہ بات بار بار سامنے آتی ہے کہ سیماب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی اسلامی موضوعات اور روحانی جذبات کے اظہار میں طمانیتِ قلب و روح محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی نظموں میں تصوف کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور بلا شبہ ''نے ستاں'' میں پیش کردہ ان کی نظمیں اپنے ابھرتے ہوئے فنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جذبات انسانی کی بہترین آئینہ دار ہیں۔

''کارِامروز''

علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''کارِامروز'' ان کے پہلے مجموعے ''نے ستاں'' کی اشاعت کے دس سال بعد ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں موضوعات کا خاصا تنوع ہے۔ اس میں سیاست، اخلاقیات، انسان و انسانیت، پند و موعظت، شخصیات، حسن و عشق، وطنیت، ادبیات اور حقائق و معارف وغیرہ موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے ''کارامروز'' کی نظموں کے ذریعہ قوموں کو زندہ رہنے کا پیغام دیا ہے اور ان میں محبت و صداقت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس میں منظر نگاری کے بہترین نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ سیماب کے والد ایک نیک اور بزرگ انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی عمدہ و پاکیزہ طور پر تربیت کی تھی جس کا اثر ان کے عہد شباب تک کی شاعری پر صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ سیماب کی نظموں کے پہلے مجموعے ''نے ستاں'' میں اس تربیت کے عمدہ و پاکیزہ نمونے موجود ہیں اور ان کی دینی و مذہبی شخصیت ہر نظم میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے اور اکثر جگہ وہ جذباتیت سے معمور نظر آتے ہیں۔ لیکن زیر نظر مجموعے میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں سیماب صاحب سماجی، سیاسی، اخلاقی، جغرافیائی غرض ہر طرح کے مطالعے و مشاہدے کا اظہار فنکارانہ انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور ہمہ رنگی نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ جس طرح حالؔی، شبلؔی، اکبؔر، چکبستؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، ظفر علی خاںؔ اور جوشؔ ملیح آبادی کی قومی و وطنی شاعری اپنے مخصوص انفرادی رنگ کی عکاس ہے، اسی طرح سیماب اکبرآبادی نے بھی اس میدان میں اپنی انفرادیت قائم کی، اور اپنی قومی و سیاسی نظموں میں نئی نئی شکلیں پیدا کیں ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات و حادثات اور انقلابات سے شاعر کا متاثر ہونا فطری ہے، سیماب کی شاعری

بھی اپنے دور کے حالات سے متاثر ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان زبردست سیاسی تحریکات وانقلابات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ان حالات میں ان کی سیاسی اورقومی شاعری وجود میں آئی۔اسی لئے ''کارِامروز'' کے موضوعات میں سیاسی شاعری کا حصہ خاصی بڑی مقدار میں موجود ہے۔

سیاسی شاعری : سیماب اکبرآبادی جب ''کارِامروز'' میں قومی، سیاسی اور وطنی نظموں پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی نگاہ میں وہ تمام واقعات وحادثات موجود ہوتے ہیں جن میں وہ سیاست کو انسانیت کے زوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''طلوع سیاست'' میں انھوں نے اسی خیال کو اپنے اظہار کا مرکز بنایا ہے۔نظم سے یہ بند ملاحظہ ہو:

رسم و آئین محبت پر تباہی آ گئی　　صبح فطرت کی سپیدی میں سیاہی آ گئی
بھول بیٹھا ہے آدمی انجام کار زندگی　　سرنگونی میں ادائے کجکلاہی آ گئی
ذرۂ ناچیز سورج بن کر اترانے لگا　　خاک کے سر میں ہوائے بادشاہی آ گئی
خوش نخوت میں سیاست نے کئے ایسے گناہ　　تنگ اپنی جاں سے خود بے گناہی آ گئی
محفلِ مہرووفا سے بےخودی رخصت ہوئی　　خود نمائی صورتِ قہر الٰہی آ گئی

مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہوگیا
نام اس قانونِ وصفی کا ''سیاست'' ہوگیا [۱]

اس مجموعہ کی پندرہویں نظم ''بساطِ سیاست'' ہے۔اس کے مطالعہ سے سیماب کی تاریخ عالم پر گہری نظر اور مختلف بادشاہوں اور فوجی سربراہوں کے دورِ اقتدار پر شاعر کی تنقیدی رائے کا علم ہوتا ہے۔اس میں جس دقت نظر اور حسن بیان کے ساتھ قدیم زمانے

۱۔ نظم طلوع سیاست، کارامروز، سیماب اکبرآبادی، ص۱۴

سے سیماب کے زمانے تک کے مخصوص مشاہیر کے کارناموں کی طرف اشارے اور ان کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے وہ ایک انوکھی چیز ہے۔ ان مشاہیر میں انھوں نے اپنے خاص مقصد کے تحت درج شخصیات کو شامل کیا ہے۔ سکندر، قیصر روم، خالد بن ولیدؓ، صلاح الدین ایوبی، نپولین، انور پاشا، مصطفیٰ کمال پاشا، مہاتما تلک، سی آر داس، لینن، گاندھی، سعد زاغلول پاشا، رضا شاہ پہلوی، امان اللہ خاں، ڈی ویلرا، محمد علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور جواہر لال نہرو۔

اس نظم میں لینن کے کردار کا تذکرہ سیماب نے کچھ اس طرح کیا ہے:

بزمِ عالم میں سیاست کے یہ طوفان دیکھ کر — تھی محبت نالۂ برلب رنگ انساں دیکھ کر
جذبۂ الفت سے تھا ناآشنا سرمایہ دار — تھا مساوات اور ہمدردی سے خالی روزگار
شخصیت کے بت نئے فرعون اور قارون تھے — جس قدر قانون تھے مزدور تھے مامون تھے
وہ مشینیں جن سے کھچتا تھا غریبوں کا لہو — وہ جہنم، جن کو ایندھن کی تھی ہردم جستجو
سرزمین روس سے آخر وہ دل پیدا ہوا — جس میں درد انسانیت کا مستقل پیدا ہوا
اس نے پھونکا فخر عالم میں صورِ انقلاب — ہوگئی بیدار اک آواز سے دنیائے خواب
بے کسی کے زرد چہرے پر خوشی کا نور تھا — افسر شاہی بساطِ محفلِ مزدور تھا

غرض اس نظم میں سیماب نے بین الاقوامی سطح کے چند مشہور مدبروں کے سیاسی کردار کا ذکر نہایت دلکش پیرایے میں کیا ہے۔ سیماب نے اپنی سیاسی نظموں میں انقلاب کے تصور کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملک کے سیاسی منظرنامے پر سی آر داس، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے حوالے سے خصوصی گفتگو کی ہے اور پنڈت نہرو کی شخصیت میں پوشیدہ زبردست امکانات پر اطمینان اور مستقبل کے لئے بھرپور امید کا اظہار کیا ہے۔ بقول اعجاز حسین:

''سیماب کا سیاسی جذبہ یا سیاست سے دلچسپی شعوری یا تقلیدی
نہیں بلکہ وسیع النظری اور عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔'' [۱]

سیماب کا سیاسی شعور اتنا بالغ اور بصیرت اتنی گہری تھی کہ بات اور کلام میں خود بہ خود تاثیر پیدا ہو جاتی تھی۔ سیماب کی شاعری کے بغور مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری براہِ راست سیاسی اظہار کی شاعری ہے۔ انھوں نے علامتوں، استعاروں اور تمثیلوں کی مدد سے بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ان کی شاعری متنوع موضوعات کی شاعری ہے۔ وہ ایک حق گو اور بے باک شاعر ہیں۔ انھوں نے جس مصنفانہ نظام کا خواب دیکھا تھا، آج کے عہد میں بہت سے علاقوں میں اس کی تعبیر سامنے آ چکی ہے۔ سیماب کی شاعری میں وہ آگ اور جذبات کی وہ لے جگہ جگہ موجود ہے جو قوموں کو خود مختاری کی جانب لے جاتی ہیں۔ ان کی نظمیں طلوع سیاست، آزار و اسیر، جذب و سلوک محبت (سیاسی نقطۂ نگاہ سے)، آزادی، اتحاد اور رہنما وغیرہ اسی طرح کے زبردست سیاسی جذبات سے لبریز ہیں اور ان سے شاعر کا سیاسی قد بہت بلند اور نقطۂ نظر بہت وسیع نظر آتا ہے۔

یہ تمام نظمیں سیماب کی سیاسی اور سماجی بصیرت کی کامیاب آئینہ دار ہیں۔ سیماب کا کمال فن یہ بھی ہے کہ انھوں نے سماج کے تلخ حقائق کے اظہار میں پوری سادگی، سنجیدگی اور خلوص سے کام لیا ہے۔ ان کی نظموں میں تفکر کا بھی گہرا احساس ملتا ہے اور وہ سیاسی اور سماجی حقیقتوں کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر بصیرت اور فنی ریاضت کے شواہد رکھتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''بساطِ سیاست'' کا پہلا ہی بند اپنے اندر بڑے امکانات رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عہد اولیٰ کی سیاست شمع خلوت خانہ تھی انجمن اصلاح اور تہذیب سے بیگانہ تھی

۱۔ سیماب کے کلام میں سیاسی عناصر، اعجاز حسین، الوارث سیماب نمبر، ۱۹۴۹ء، ص ۴۶

جنگ ہوتی تھی مگر حسن و محبت کے لئے　　لوٹ دی جاتی تھی دنیا ایک عورت کے لئے
زندگی سے بھی زیادہ تھی ضرورت حسن کی　　حکمرانوں کے دلوں پر تھی حکومت حسن کی

سیماب کا یہ سب سے بڑا وصف ہے کہ وہ اپنی سیاسی نظموں میں فریاد کر کے خاموش نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ بالغ النظری سے اس کا علاج بھی بتاتے ہیں۔ سیماب کے یہاں پیغامات اور ان کی اختیار کردہ شاعرانہ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ اصلاح اور تعمیر و ترقی، فکر و نظر کی بیداری اور ذہنی انقلاب سے عمل میں آسکتی ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی نظم ''بساطِ سیاست'' کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> ''سیماب کی نظم بساطِ سیاست اور جوش کی نظم ملکوں کا رجز کا آہنگ یکساں ہیں۔ جوش نے ملکوں کے نام لے کر وہاں کی خصوصیات بتائی ہیں، جب کہ سیماب نے اس سلسلے میں ملک کے مقتدر رہنماؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نظم میں سیماب نے بتایا ہے کہ ابتداء سے سیاست کس طرح ارتقاء پذیر ہوئی۔ یہ عالمی سیاسی رجحانات کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ سکندر، قیصر روم، خالد، صلاح الدین ایوبی، نپولین وغیرہ عملی سیاست میں بڑے اہم نام ہیں۔ انور پاشا اور مصطفیٰ کمال نے ترکی میں جمہوریت قائم کی۔''[۱]

سیماب ہندوستان کے سیاسی اور سماجی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھیں وطن اور اہل وطن سے غیر معمولی پیار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ایک ذمہ دار فرد کی طرح ملک

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۴۸

وقوم کی حیات اجتماعی کوسنوارنے کے لئے فکرمند تھے۔ڈاکٹر پرویز شاہدی لکھتے ہیں:

''سیماب کا سیاسی کلام جوش وخروش، نظم وضبط، صدق وخلوص، شعور وادراک، شدت وحرارت، لطافت ونزاکت وغیرہ کا آئینہ نظر آئے گا جس میں بعد کی سیاسی شاعری کا چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے۔[۱]

نظم ''طلوع سیاست'' کے ساتھ ساتھ ''جذب وسلوک'' بھی سیاسی نقطۂ نگاہ سے اہمیت کی حامل ہے جس میں سیماب نے اپنے سیاسی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔''جذب وسلوک'' میں انھوں نے جو درس دیا ہے وہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ تمام اقوام کے لئے ہے۔اس نظم سے درج ذیل بند ملاحظہ ہو:

کام ہونا چاہئے وعدوں سے کچھ حاصل نہیں — اب فقط امید ہی وجہ سکونِ دل نہیں
دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں — دوسرا دل ہے ہمارا عقدۂ مشکل نہیں
اہل غیرت ہیں پشیمانیٔ ماضی سے ہلاک — حال میرا یہ کہ مجھ کو فکر مستقبل نہیں
جس کو دیوانے ترا حسن کرم سمجھا کئے — وہ فریبِ لطف کرم اب برداشت کے قابل نہیں
کامیابی کی تمنا ہے تو کچھ تدبیر کر — صرف قسمت کا گلہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں
جوش کہتا ہے لگا دو دستِ ہستی میں آگ — عقل کہتی ہے کہ وقتِ گرمیٔ محفل نہیں

سالک تدبیر ہوں غالب نہیں جذبِ وخروش
ناشکیب اتنا ابھی سیماب میرا دل نہیں

۱۔ سیماب اکبرآبادی۔سیاسی شاعری کے ایک عظیم ستون، پرویز شاہدی، شاعر، اگست۔ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۳۶

''جذب وسلوک'' میں سیماب نے جو سیاسی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ہندوستان کے سیاسی مسائل اور سماجی افراتفری پر ہی نظر نہیں رکھتے بلکہ وہ عالمگیر سیاست کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔ سیماب نے اپنی سیاسی نظموں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے نظموں کے ذریعہ اپنے سیاسی رجحانات کا برملا اظہار کیا۔ سیماب کا یہ خاص وصف ہے کہ انھوں نے محبت میں بھی سیاست کا پہلو تلاش کیا۔ چونکہ اس دور میں سیاست کا غلبہ اتنا زیادہ تھا کہ محبت بھی سیاسیات کی روشنی میں دیکھی جانے لگی تھی۔ چنانچہ سیماب نے نظم محبت (سیاسی نقطۂ نگاہ سے) جس نوعیت سے لکھی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا سمجھے قوانین جہان مادیت کو — غرض مندی کا اک آلہ بنا ڈالا محبت کو
محبت خودغرض ہے، عشق ہے ایک جوش نفسانی — نہ آئی شرم اس اعلان سے اہل سیاست کو
یہ تنقید غلط ہی حسن کو بدظن بناتی ہے — سمجھتا ہے ہوس وہ جذبۂ اربابِ الفت کو
محبت کی سیاست پوچھئے ان مٹنے والوں سے — جو فرش خاک پر بیٹھے ہوں ٹھکرا کو حکومت کو
محبت کونسل اور عدالت میں نہیں ملتی — دلِ ویران میں ڈھونڈا اس ماہتاب بزمِ الفت کو
یہ وہ علم ہے جس کو عرش سے تعلیم ہوتی ہے — سیاست خاک پہچانے محبت کی حقیقت کو

فنائے روح ہے ذوق محبت کی گراں جوشی
ہے خودغرض سیاست اور محبت خودفراموشی

سیماب نے نظم میں محبت موضوع رکھ کر اس سے سیاست کا ایک نیا پہلو تلاش کیا ہے۔ انسان کو خودغرضی یا خودفراموشی کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ خودفراموشی پر خودغرضی ہمیشہ غلبہ پاتی ہے۔ ''کارِ امروز'' کی دوسری نظموں میں آزادی، جذب وسلوک، اتحاد اور

رہنما بھی سیاسی نوعیت کی نظمیں ہیں، جن میں سیماب نے اپنے سیاسی زوایہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ نظم آزادی سے اپنے حسن کے ساتھ سیاست کے بیشتر پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

وہ اک حور مجسم صد بہار و صد چمن در بر — نشاطِ دو جہاں دردِ دل، حیات انجمن در بر
سیاہ و مست لمبے بال، پیچ و خم سے بیگانہ — نشیلی انکھڑیاں، لیکن مذاقِ رم سے بیگانہ
زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں — لبِ خودرنگ پر مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں
ہمالہ کی پری، اور طور کا اک جلوۂ رعنا — جو اس کی اک نظر زمزم تو اس کی اک نظر گنگا
تعصب اور نفرت کے لہو سے دست و پا رنگیں — وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں، ہر ادا رنگیں
تنفس میں نجات اس کے، ترنم میں حیات اس کے — تکلم گلستاں اس کا، جلو میں کائنات اس کے
وہ فطرت سے براہ راست رشتہ جوڑنے والی — غلامی اس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی

وہ شہزادی ہے، میں اس کی محبت کا بھکاری ہوں
وہ آزادی کی دیوی میں اس کا پجاری ہوں

نظم ''آزادی'' میں سیماب نے جو پیکر تراشی کی ہے وہ ایسے پراثر اور دلنشیں انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والے کی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ اسی طرح نظم آزادی میں سیاست کی عمدہ مرقع کشی کی گئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ البتہ شاعر اس قسم کی آزادی نہیں چاہتا جس میں سیاست نے اپنے مفوضہ قوانین کو غلام بنا لیا ہو، بلکہ وہ اس آزادی کا نقشہ کھینچتے ہیں جس میں بال بھی اپنے پیچ و خم سے بیگانہ نہ ہو اس لئے کہ پیچ و خم سے بھی سیاست کی بو آتی ہے۔

''انقلاب روس'' اور ''اس کی یاد میں'' بین الاقوامیت اور آفاقیت کی حامل نظمیں

ہیں۔ ان میں سیماب نے انسانیت کو ترجیح دی ہے۔ انھوں نے ''انقلابِ روس'' کو سیاسی انقلاب کا مرکزِ خیال تصور کیا ہے۔ اسی بدولت انھوں نے انقلاب روس کو ایک خاص انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ نمونے کے لئے نظم ''انقلابِ روش'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب ہستی طوفانوں میں اک قطرہ غوطے کھاتا ہے
آہستہ آہستہ آخر جزو طوفاں ہوجاتا ہے
ادبار کے بادل اٹھتے ہیں، افکار کی فوجیں اٹھتی ہیں
گردش کے تیز تھپیڑوں سے عبرت کی موجیں اٹھتی ہیں
یوں زرمستانِ عالم میں تکمیل حوادث ہوتی ہے
خود نشو ونمائے ہنگامہ، تحلیل کا باعث ہوتی ہے

علامہ سیماب کی شاعری درحقیقت زندگی کا آئینہ ہے جس میں ان کے دور کی سیاسی وسماجی، معاشرتی وتہذیبی واصلاحی تحریکات اوران کی کشمکش کی بڑی واضح تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ادب کو سماجی، تہذیبی اور سیاسی آلۂ کار کی شکل میں استعمال کیا ہے۔ نظم ''کسی کی یاد'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دورِ صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو — اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھ کو
ہم نفس فکرِ خوشی کیا جو بہار آئی ہے — زندگی میں ہے فقط، فرصتِ ماتم مجھ کو
اپنے بچھڑے ہوئے احباب کا ہے سوگ مجھے — بزمِ عبرت ہے طرب خانۂ عالم مجھ کو
ابھی خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گل ریز — نظر آتا ہے یہ گلشن ابھی مبہم مجھ کو
صحنِ گلشن میں وہ ہنگامۂ پرواز نہیں
ساز موجود ہے پیدا مگر آواز نہیں

اس نظم میں سیماب کا سیاسی شعور بڑا نکھرا ہوا اور پختہ ہے اور یہ نظم ان کے سیاسی رجحانات کی بڑی عمدگی سے نمائندگی کرتی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیماب کا یہ مجموعہ موضوع کے اعتبار سے گلہائے رنگارنگ کا ایک حسین گلدستہ ہے جس میں سیاست پر شاعر نے بہت پر منفرد اور بلیغ انداز میں اپنے ہمہ جہت خیالات کا دلکش انداز میں اظہار کیا ہے۔

شخصیات پر مبنی نظمیں : ''کارِ امروز'' میں سیماب صاحب کی متعدد ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو انھوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح کی سیاسی، علمی، مذہبی یا ادبی شخصیات پر لکھی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسی ہندوستانی شخصیات ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی انداز سے ملک و قوم کی خدمت کی ہے یا ہندوستان کی آزادی کے لئے حد درجہ کوشش کی ہے۔

جن شخصیات پر سیماب نے باقاعدہ طور پر مکمل نظمیں لکھی ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں: رسول اکرم حضرت محمد ﷺ، گوتم بدھ، سری کرشن، گاندھی جی، محمد علی جوہر، ناصر علی خاں، غالب، داغ، نور جہاں ثانی، شاہ جہاں اور نظیر اکبر آبادی۔ ان کے علاوہ نظم ''بساطِ سیاست'' میں انھوں نے ملکی و بین الاقوامی ۱۹ مشاہیر پر باقاعدہ طور پر اپنے منظوم خیالات پیش کئے ہیں، ان کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جاچکا ہے۔ یہ شخصیات ایسی ہیں جو اپنے اپنے زمانے میں انقلاب پیدا کرنے کی موجب ہوئیں۔ مثلاً کسی نے مذہب و روحانیت کے ذریعہ انقلاب پیدا کیا ہے اور کسی نے علم و ادب میں اور کسی نے ہندوستان کے انتظام حکومت اور فن تعمیرات میں۔ غرض ان کے کارناموں اور نقوش سے ہندوستان روشن ہے اور ان کے کارنامے بھی رہتی دنیا تک محفوظ رہیں گے اور نام بھی۔

ان شخصیات سے متعلق سیماب نے اپنے قلبی احساسات وتاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مذہبی کردار وعقائد، ان کے ذہنی وفکری ارتقاء اور سماج پر ان کے اثرات کا بھی برملا اظہار کیا ہے۔ ان شخصیات کے مختلف مذاہب ومسالک سے وابستہ ہونے کے باوجود باہمی اتحاد و رواداری کے جذبات کو بہت خوبصورت اور دل نشین انداز میں سیماب نے بیان کیا ہے۔

''کارِ امروز'' میں جن شخصیات کا تذکرہ بہت نمایاں ہے ان میں سری کرشن اور رسول اللہ ﷺ کی ذات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

رسول کائنات ﷺ کے عنوان سے تحریر کردہ ان کی نظم تین بندوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے جذبات کے ٹھہراؤ، عالمانہ وقار اور حقیقت پسندانہ پیش کش کے ساتھ آپؐ کی ذات اقدس کے انقلاب آفریں پہلوؤں کو بطور خاص بیان کیا ہے۔ پہلے بند میں پس منظر کے طور پر دنیا میں پھیلی ہوئی جہالت، ظلم و استبداد، خونریزی، حکومتوں کی من مانی، گندی سیاست، بت پرستی، خدا فراموشی اور اس کے نتیجے میں پنپنے والی تمام خرابیوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔

دوسرے بند میں مکہ مکرمہ میں آپؐ کی پیدائش کے بعد آپؐ کے انقلاب انگیز پیغامات کی طرف اشارہ کئے ہیں جن میں آپؐ کی ذات اقدس میں تجلیات روحانی اور نور انبیاء کا ذکر کر کے یہ واضح کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے محبت کی بنیاد پر سیاست کی فضا استوار کی، توحید کا پیغام دے کر پوری دنیا کو وحدت و اتحاد کی تسبیح میں پرو دیا، سیاست کو مذہب کے اور تمدن کو اعلیٰ تہذیب کے تابع کر کے اخوت، محبت، مساوات اور بھائی چارگی کا پورا ماحول پیدا کرایا اور زندگی کے اپنے نئے اصولوں سے ماحول میں روحانیت وتقدس اور پاکیزگی اور تقویٰ وطہارت کی ایسی فضا پیدا کی کہ خونی دشمن بھائی بھائی بن گئے۔

تیسرے بند میں آپؐ کی ذات اقدس میں حضرت ابراھیمؑ کی جانشینی اور حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی صفات کی موجودگی کے نتیجے میں پورے عالم پر آپؐ کے کریمانہ اخلاق اور روحانی فیض وشفقت کے اثرات کی نشاندہی بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ تمام عالم کے لئے آپؐ کی ذات رحمت ہے۔ اگر تمام انسانیت آپؐ کی پیروی کرلے اور آپؐ کے بتائے ہوئے اصول زندگی، سیاست ومعیشت سیکھ لے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے تو انسانیت ہی نہیں ساری کائنات آزاد اور باہم متحد ہو جائے۔

نظم ''رسولِ کائنات'' میں سیماب اکبرآبادی حضرت محمدﷺ کی عظمت کا اظہار بہت عقیدت اور دل کی گہرائیوں سے کرتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:

مدبر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا — سیاست میں بھی جس نے کی محبت کی ادا پیدا
ادہر باطل کی ظلمت میں حقیقت کی ضیاپوشی — ادہر اس کی تجلی میں خودی پنہاں خدا پیدا
اصول نو یہ قائم کی اساسِ زندگی اس نے — کمالِ روح سے کر کے مقدس تر فضا پیدا
غلاموں کو دیا دل کھول کر پیغام آزادی — کیا احساس اعرابی میں رنگ ارتقا پیدا
عرب سے تا عجم وحدت کا سکہ کر دیا جاری — نیا بتخانے کے ماحول سے، کعبہ کیا پیدا
سیاست کو کیا مذہب کے تابع اپنی قوت سے — مذاق سجدہ سرافرازیوں میں کر دیا پیدا
تمدن کو کیا آراستہ تہذیب کامل سے — تدبر سے کیا دنیا و دیں میں واسطا پیدا

ان الہامی مساعی کا بالآخر یہ نتیجہ تھا
کہ جو قانون فطرت تھا وہی قانون دنیا تھا

سلام اے صبح کعبہ، السّلام اے شام بت خانہ — تو چمکا بزم آذر میں بہ انداز خلیلانہ
حریم پاک ترا اک بلند ایواں حقیقت کا — جہاں جبریلؑ بھی ہے مختصر سا ایک پروانہ
کہیں تو زندگی پیرا بہ اعجاز لب عیسیٰؑ — کہیں تو خطبہ فرما، اوجِ طائف پر کلیمانہ

فروغِ آفرینش قوتوں پر تیری قائم ہے　　کہیں تو شمع محفل ہے کہیں تو نورِ کلشانہ
یہ دنیا تری نظروں میں مثال نقطۂ ناقص　　یہ عالم سامنے ترے بقدر ظرف یک دانہ
مجھے معلوم ہے رازِ علامی اہلِ عالم کا　　ہے آداب سیاست سے ترے ذہن انکا بیگانہ
اگر پیرو تیرا پھر عالم ایجاد ہوجائے
تو انسان کیا یہ ساری کائنات آزاد ہوجائے

سیماب اکبرآبادی کو سری کرشن سے گہری عقیدت و محبت ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظموں اور نثری تحریروں میں بھی کیا ہے۔ زیر مطالعہ نظم سری کرشن میں انھوں نے بالخصوص ان کے پیغام محبت کو پیش کیا ہے۔ اس میں منظر کشی بھی کی ہے اور ان کے پیغام کی پیش کش بھی۔ ملاحظہ ہو:

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لے کر　　سرور آنکھ میں نظروں میں زندگی لے کر
گزشتہ شب صبح محبت کو ڈھونڈھنے نکلا　　اک آفتاب، محبت کی روشنی لے کر
خودی کے ہوش اڑانے بصد نیاز آتا　　نئے پیالوں میں صہبائے بےخودی لے کر
فضائے دہر میں گاتا پھرا وہ پریت کے گیت　　نشاط و دشت میں فطرت کی چاندنی لے کر
جہانِ قلب سراپا گداز بن ہی گیا
ہر اک ذرہ محبت کا ساز بن ہی گیا

سیماب کو سری کرشن سے عقیدت و محبت ایسی ہے کہ تصور میں ان کو کہیں دور سری کرشن کی بانسری کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کی میٹھی آواز کانوں تک آرہی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نغموں سے زمانے کو معمور و مسحور کردیا ہے۔ وہ اپنے ان نغموں سے صداقت و محبت کے بیج بوتے ہیں، محبت کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ اس نظم سے یہ بند

ملاحظہ ہو:

کیا زمانے کو معمور اپنے نغموں سے　　سکھائے عشق کے دستور اپنے نغموں سے
صداقت اور محبت کی اس نے دی تعلیم　　اندھریوں میں بھرا نور اپنے نغموں سے
بنائے طور تجلی سے اپنی بن بن میں　　دکھایا جلوۂ مستور اپنے نغموں سے
جو روح غم کی تہوں میں کہیں ملی مغموم　　اسے بھی کردیا مسرور اپنے نغموں سے
لطافتوں سے کیا ارض ہند کو لبریز　　کثافتوں کو دور اپنے نغموں سے

فلک کو یاد ہیں اس عہد پاک کی راتیں
وہ بانسری وہ محبت کی سانولی راتیں

سیماب نے سری کرشن کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مصوری و پیکر تراشی کے ذریعہ قارئین کے دل کے ان تاروں کو چھیڑ دیا ہے جو ان کے ذوق واحساس کو بہت زیادہ تکمیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس میں جذبات کی پاکیزگی بہت نمایاں ہے۔ ساحل ٹونکی نظم ''سری کرشن'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''سری کرشن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، اس میں تخیل کی کارفرمائیوں سے کہیں زیادہ دل کی لطافتیں شامل ہیں۔ بڑی ہی پیاری اور پاکیزہ نظم ہے اور حقیقی تجلیات کی آئینہ دار ہے۔'' [۱]

سیماب نے سری کرشن اور گوتم بدھ سے متعلق نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کے لباس میں جلوگر کیا ہے۔ وہ سری کرشن کی عظمت اور ان کے صداقت و محبت کے پیغام کا تذکرہ جوش وعقیدت سے کرتے ہیں۔ اس قسم کی تمام نظموں سے ان کی بے تعصبی ظاہر ہوتی

۱۔ حامد سعید خاں ساحل ٹونکی، شاعر، کارِ امروز نمبر، ۱۹۳۷ء، ص ۷۸

ہے۔ زیر مطالعہ نظم کے علاوہ دوسرے مجموعوں کی نظموں ''وہ بانسری کہاں ہے''، ''میرا خطاب سری کرشن کی قوم سے'' میں بھی ان کا یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

ان کی شخصی نظموں کے متعلق نیاز فتحپوری لکھتے ہیں:

> ''شخصی نظموں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ بہتر نظم سری کرشن کے متعلق ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ مذہب میں سری کرشن ہی کی زندگی ایسی زندگی ہے جو شاعر کے احساساتِ حسن کو بیدار کرسکتی ہے۔ انھوں نے کائنات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن ان میں وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔'' [۱]

''نے ستاں'' کے برعکس ''کارِ امروز'' میں سیماب خالص ہندوستانی شاعر نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کا مزاج، انداز فکر اور لب ولہجہ یکسر بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اب وہ صرف ہندوستان سے محبت نہیں کرتے بلکہ وہ ہندو مذہب کو بھی عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے کرشن گیتا کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مجھے ہندو مذہب کے قدیم اور تاروں میں صرف سری کرشن سے عقیدت ومحبت ہے۔ اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رومان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق ومحبت کے جتنے نغمے پھیلے ہیں ان کا سرچشمہ میں سری کرشن کی مشہور بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔ وہ کرشن جی سے اپنی محبت کا دوسرا سبب بتاتے ہیں کہ اگر برج کی سرحد واقع ہے اور میں اکبرآبادی ہونے کی حیثیت سے گو برج باسی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا مگر اس کا ہمسایہ ضرور ہوں، اس لئے مجھ پر سری کرشن کا روحانی اثر ایک فطری اور عمرانی چیز ہے۔ انھوں نے تیسرے سبب کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ میں سری کرشن کی زندگی میں ایشیاء

۱۔ سیماب اکبرآبادی کا مجموعہ نظم باب الانتقاد، نیاز فتحپوری، نگار، اپریل ۱۹۳۵، ص ۵۰

کے بعض دوسرے پیغمبروں سے مماثلت پاتا ہوں۔ ان کے ابتدائی حالات حضرت موسیٰؑ سے ملتے ہیں۔ چوتھے سبب میں وہ لکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کی تعلیم ہر انسان کے لئے مجھے یکساں مفید اور قابل عمل نظر آتی ہے۔ اور میں اس کے اشلوکوں میں سرتاسر روحانیت پاتا ہوں۔ اور پانچواں سبب عقیدت والفت کا یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ ایسی نظموں کی ترویج سے ہندوستان میں متحدہ قومیت کے لئے رواداری اور بے تعصبی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ [۱]

سیماب اکبرآبادی نے گوتم بدھ اور گرونانک پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ وہ نانک اور گوتم بدھ کو بھی گیان کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ ان کی نظم گوتم بدھ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن جب افسردہ پھولوں کی طرح پامال تھا — جب محبت کا غلط دنیا میں استعمال تھا
بے خودی کے نام سے جب دورِ جام بادہ تھا — جب تجلیٔ حقیقت سے ہر اک دل سادہ تھا
نفس تھا جب عیش کو راز بقا سمجھے ہوئے — جب ہوس تھی صرف "عورت" کو خدا سمجھے ہوئے
زیست کا اور موت کا ادراک دنیا کو نہ تھا — ظلم کا احساس جب بے باک دنیا کو نہ تھا
علم و عرفان الٰہی کی شہادت تو نے دی — غور کرنے کی دلِ انسان کو فرصت تو نے دی
بند آنکھیں کر کے اس دنیا کے مکروہات سے — تو نے حاصل کی ضیائے دل تجلیات سے
برف زاروں کو تیرے انفاس نے گرما دیا — تخت شاہی کو تیرے احساس نے ٹھکرا دیا
یاد تیری آج بھی ہندوستان میں تازہ ہے — چین، جاپان اور تبت تک ترا آوازہ ہے

روشنی جس کی نہ ہوگی ماند، وہ مشعل ہے تو
سرزمین ہند کا عرفانی "اول" ہے تو

سیماب نے نظم گوتم بدھ میں اپنے علم وعرفان کے دریا بہائے ہیں۔ ان کے پیغامِ عرفانی کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کو بھی یاد کیا ہے، جس میں صداقت، محبت، نغمۂ عرفانیت

۱۔ کرشن گیتا، سیماب اکبرآبادی، ص ۵۔۶

اور شگفتگی سے لبریز نظر آتی ہے۔ سیماب کے ان احساسات میں ہر مذہب وملت اور عقیدہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

ان کی نظموں میں جو روانی اور طبیعت میں جوش بیان ہے وہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے جذبے پر دلالت کرتا ہے اور اس جذبے سے اشعار میں جو روانی سرور اور فور پیدا ہوا ہے اس کا سرچشمہ بعد میں ارتقاء پذیر ہونے والی عمیق مذہبی حسیت ہے جس نے شاعر کو فن کا سانحہ اس نہج پر ترتیب دینے کے لئے یک سو کر دیا تھا اور اس طرح وہ اپنے جذبات ربط وتسلسل کے ساتھ ایک منظّم ہیئت میں بہت عمدگی سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس میں فنی حسن کے ساتھ دیگر محاسنِ شعری کا بھی بھرپور مظاہرہ ہوا ہے۔

قومی اور وطنی نظمیں : انجمن پنجاب کے قیام کے بعد مولانا آزاد اور حالؔی نے اپنی نظموں میں جن موضوعات کو بطور خاص اختیار کیا تھا ان میں حب وطن وقوم بہت اہم موضوع تھا۔ بیسوی صدی تک آتے آتے اس میں اور شدت پیدا ہوگئی اور اس صدی کے ربع اول میں ہر طرف حب وطن سے متعلق نظموں کا چرچا ہوگیا اور اس طرح کے موضوعات پر اردو میں نظمیں لکھنے کی روش عام ہوگئی۔ ملک کے سیاسی حالات ایسے ہوگئے کہ شعراء کے دلوں میں وطنی شاعری کے لئے جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ چنانچہ حالؔی، اقبالؔ، چکبستؔ، سرورؔ جہاں آبادی، ظفرؔ علی خاں، سیمابؔ، جوشؔ، تلوک چند محرومؔ وغیرہ اسی نوع کے چند شعراء کے نام ہیں۔ لہٰذا اس زمانے میں قومی اور وطنی شاعری کو بڑا فروغ ملا۔

قومی و وطنی شاعری میں سیماب اپنے بزرگ اور ہمعصر شعراء کی تیار کردہ شاہراہ پر چلے اور انھوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہوکر شاعری کی۔ انھوں نے وطن کی محبت میں

والہانہ انداز میں نغمے گائے اور ضرورت پڑی تو اس کی زبوں حالی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔

''کارِ امروز'' میں ۱۹۱۸ء کے بعد کی نظموں میں وطنیت پورے طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ سیماب کے ذہنی وفکری ارتقاء میں ہندوستانی آب وہوا اور دوسرے تہذیبی وثقافتی عناصر بدرجہ اتم کارفرما ہیں۔ اسی لئے انھوں نے حب الوطنی کے نغمے خوب گائے ہیں۔ اس کے علاوہ تہذیبی قدروں کی پامالی کو بھی موضوع بنایا ہے اور اس کے اسباب وعلل بھی بتائے ہیں۔ ان کی حب الوطنی سے متعلق نظم ''میرا وطن'' سے ملاحظہ ہو:

جہان نور بنا ہے، میرے وطن کے افق سے　　طلوعِ رنگ وضیا ہے، میرے وطن کے افق سے
ہے آفتاب کا مولد، سواد میرے وطن کا　　بہار جلوہ نما ہے میرے وطن کے افق سے
گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں صرف میرے وطن میں　　نزولِ آب بقا ہے، میرے وطن کے افق سے
یہیں نمودِ سحر ہے، وجودِ شام یہیں ہے
غرض فرائضِ فطرت کا اہتمام یہیں ہے

اسی نظم میں آگے چل کر وہ یوں کہتے ہیں:

کھلا یہ راز ہیں باطل قیود میرے وطن کی　　ہیں بے نیاز تعین حدود میرے وطن کی
جہانِ فکر سے باہر میرے وطن کی حدیں ہیں　　نہیں اسیر نظر ہست و بود میرے وطن کی
سمن سے تا بہ سما ہے میرے وطن کی تجلی　　ثریٰ سے تا بہ ثریا، نمود میرے وطن کی
زمیں کی سطح سے تا آسماں میرا وطن ہے
یہ فیصلہ ہے کہ ''سارا جہاں میرا وطن ہے''

حب وطن انسان کے اعلیٰ ترین جذبات میں سے ایک ہے اور اچھے انسانوں میں یہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد اس جذبے کی شکل سیاسی

اور قومی ہوگئی۔ سیماب نے ایک اچھے فرد اور سچے محبّ وطن کی طرح اپنے لئے اسی جذبے کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''سیماب بھی اپنے ہمعصر شعراء کی طرح وطنی محبت سے سرشار تھے۔ انھوں نے والہانہ انداز میں وطن کی عظمت کے گیت گائے اور اس کی زبوں حالی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔ ان کے تخیل کی بازگشت وطن ہی سے مواد حاصل کرتی ہے جس سے ان کی گہری وطنی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔''[۱]

سیماب اکبرآبادی نے حب الوطنی کے جذبہ کو شعری پیکر عطا کیا جس میں انھوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ وطن کی محبت کے اظہار میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار بہت خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نظم ''وطن' ان کے اس جذبے کی عکاس ہے۔ ملاحظہ ہو:

جہاں جاؤں وطن کی یاد میرے ساتھ رہتی ہے — نشاطِ محفل آباد میرے ساتھ رہتی ہے
کوئی اہل وطن جب مجھ کو مل جاتا ہے غربت میں — وطن یاد آ کے کیا کیا مجھ کو تڑپاتا ہے غربت میں
وطن کا حال اسے پوچھتا ہوں مضطرب ہو کر — تصور میں پیا کرتا ہوں اس کے پاؤں دھو دھو کر

☆☆

وطن پیارے وطن تیری محبت جزو ایماں ہے — تو جیسا ہے جو کچھ ہے سکونِ دل کا ساماں ہے
وطن میں مجھ کو جینا ہے وطن میں مجھ کر مرنا ہے — وطن پر زندگی کو ایک دن قربان کرنا ہے

وطن کی خاک سے اٹھا ہوں رنگیں پیرہن ہو کر
وطن کی خاک میں مل جاؤں گا خاکِ وطن ہو کر

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۷۳۔۷۴

نظم ''وطن'' سیماب نے ۱۹۳۴ء میں لکھی۔ اس نظم کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیماب کے لئے اپنے وطن میں ہی سب کچھ موجود ہے۔ علامہ کو اپنے وطن سے جو محبت ہے اس کا اظہار ان کی دوسری نظموں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً فردوسِ وطن، ارض تاج، دیال باغ، درۃ التاج، جودا بائی کا مندر اور روضۂ ممتاز وغیرہ خصوصیت کی حامل ہیں۔ بہرحال وہ اپنی نظموں کے ذریعہ فرزندانِ قوم کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ۱۹۳۰ء کے اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں کہ:

''ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے مطابق اہل ملک اور فرزندانِ وطن کے لئے ایک مستقبل کا پیغام ہونا چاہئے۔'' [۱]

درحقیقت سیماب کی نظموں سے نہ صرف وطن کی محبت، عظمت اور قدر و منزلت جھلکتی ہے بلکہ وطن و قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے بھی ایک عالمانہ پیغام ملتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے کو آزادانہ طور پر دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کی قوم میں تابنا کی اور درخشندگی پیدا ہو جائے تا کہ سارا جہاں روشن و تابناک نظر آئے۔ وہ اپنی قوم میں صورِ سرافیل پھونکنے کے خواہاں تھے۔

ان کا ایک مقصد نظموں کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا تھا اور وہ حب قوم کے ذریعہ وطن کے روشن مستقبل کے حامی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جوانانِ وطن کو آگے بڑھنے کی رغبت دلاتے ہیں اور بڑھے چلو کا نعرہ بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ نظم ''قدم بڑھائے چلو'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہو لاکھ مشکلیں پیدا قدم بڑھانے میں　　فلک رہے تمہیں مصروف آزمانے میں

۱۔ سیماب اکبرآبادی، کلم عجم، ص ۲۸

بلا سے برق کا مسکن ہو آشیانے میں　　بلا سے زلزلے آتے رہیں زمانے میں

مگر ثبات میں لغزش نہ آنے پائے چلو

قدم بڑھائے چلو!

تم اپنے عزم وفا سے نہ انحراف کرو　　چلے چلو یونہی، ٹھہرو نہ اعتکاف کرو

نہ رہزنوں کو کسی شرط پر معاف کرو　　جو راستے میں ہو حائل اسی کو صاف کرو

تم اپنی قوتِ بازو کو آزمائے چلو

قدم بڑھائے چلو!

سیماب ایک سچے وطن پرست اور عظمتِ مشرق کے دلدادہ ہیں۔ ان کے شعری ترانوں میں وطن پرستی کے جذبات اعلیٰ انسانی تصور میں ڈوب کر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ وطنیت اور انسانیت کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو دیتے ہیں۔ ایک محبّ وطن اپنے آرام و آسائش سے زیادہ قوم و ملک کے لئے متفکر رہتا ہے۔ سیماب نے اس نظم میں محض قوم کی بدحالی کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ اہلِ قوم کے ضمیر کو جھنجوڑا بھی ہے۔ انھوں نے اخوت اور ہمہ گیر محبت، اتحاد اور مساوات کی اہمیت کو بھی روشن کیا ہے۔ سیماب کو وطن سے اور اس کی تہذیبی و روایتی اقدار سے جتنا انس تھا، اردو شاعری میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ نظم ''میرا وطن'' میں جن جذبات کو پیش کیا گیا ہے، علامہ اقبال ان کو ترانۂ ہندی، نیا شوالہ اور ہمالہ میں پیش کر چکے تھے۔ لیکن اقبال، اقبال تھے اور سیماب، سیماب۔ یہ دانشوری کی بلندی اقبال ہی کے حصے میں آئی تھی اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیماب وطن کی مٹی اور مناظر قدرت کو ہر حالت میں اپنی شاعری کا حصہ بناتے رہے اور کامیاب رہے۔ ان کا ایک شعر پیش ہے۔

زمین کی سطح سے تا آسماں میرا وطن ہے
یہ فیصلہ ہے کہ ''سارا جہاں میرا وطن ہے

سیماب کی وطنی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا وطنی شعور وادراک بہت بلند و پختہ تھا۔ وہ ایک سچے محبّ وطن کی طرح قوم کے افراد کو اعلیٰ خصائل سے مزین دیکھنے کے لئے ہمیشہ متمنی رہے۔

اشتراکیت پر مبنی نظمیں : سیماب ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی گھن گرج والی شاعری کا نمونہ پیش کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان کے جذبات پر سنجیدگی اور فکر کی گہرائی غالب ہوئی ہے تو اس طرح کی ولولہ انگیز نظمیں وجود میں آئی ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے نظام اقتدار کی بساط الٹنے لگی ہو۔ نظم ''اے سرمایہ دار'' میں سیماب نے سچے جذبات اور حقائق کی آمیزش سے سرمایہ داری کے مضر اثرات کو طشتِ از بام کیا ہے۔ ہماری تہذیب اور ہمارے معاشرے کے لئے یہ سرمایہ دارانہ نظام کس قدر مضر اور مہلک ہے، اس کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے۔

اے مئے پندار سے مخمور اے سرمایہ دار — اے کہ ہے دولت پرستی ترا بے مایہ شعار
اے کہ دولت ہی تری دنیا ہے اور دولت ہی دین — اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار
زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنوں — قصۂ مزدور سننا بھی ہے تجھ کو ناگوار
اپنی عشرت گاہ میں تو محوِ خواب عشق ہے — اور مزدور ایک شکستہ جھونپڑی میں بے قرار
اُس کی بربادی پہ ترا دل کبھی سوزاں نہیں
وہم ہے تجھ کو کہ تو انساں ہے وہ انساں نہیں

ان کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری نے انسانی تہذیب پر جبر وتشدد کے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ ردعمل کے طور پر بغاوت اور انقلاب کی لہریں تیز ہوئیں۔ اسی سبب سے اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی طرح سردار جعفری کی ''اودھ کی خاک حسیں'' ہو یا ''پتھر کی دیوار'' مخدوم کی قید ہو یا موت، ہر جگہ سماج میں ہو رہے استحصال اور طبقاتی کشمکش کے سبب پیدا حالات کو موضوع بنایا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سرمایہ داری کی مذمت اور مزدوروں سے ہمدردی ایک رسم سی ہوگئی تھی۔ اسی لئے ''مزدور اور کسان'' کے عنوان پر بے شمار نظمیں لکھی گئیں۔ سیماب نے بھی مزدور کے حالات کی مرقع کشی بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ لہٰذا ان کی نظم ''مزدور'' سے اس طبقہ کی کربناک صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

گرد چہرے پر پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی — آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابل برداشت اک بارِ گراں — ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا — درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا
پانوں مٹی کی تہوں میں میل سے چکٹے ہوئے — ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے
جارہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا — ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل و واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال — چار پیسے کی توقع، سارے کنبے کا خیال
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں — بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں

گو ہے تیری ہی طرح انسان، مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ! یہ مزدور ہے

مزدور کے عنوان سے شعراء نے اکثر نظمیں لکھی ہیں۔ مگر سیماب نے اپنے تخیل کی مدد سے اس نظم میں مزدور کی حالت کا ایسا حقیقی نقشہ کھینچا ہے جو دل پر فوراً اثر کرتا ہے۔ مثلاً تیز چلنے سے کمزوری کے سبب پاؤں کی ہڈیوں کے چٹخنے کی صدا، اس کو محاکاتی انداز میں نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا　　درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

''مزدور'' اور ''اے سرمایہ دار'' سیماب کی وہ نظمیں ہیں جن میں انھوں نے ایک طرف تو سرمایہ دار اور مزدور کو اپنے تخیل سے نہ صرف مدمقابل دکھایا ہے بلکہ سرمایہ داروں کے عیش، شان وشوکت کو بھی کھل کر پیش کر دیا ہے۔ وہیں دوسری طرف انھوں نے مزدوروں کی بے بسی ولاچاری، غربت کی زندگی اور استحصال ومظالم کی بھرپور عکاسی بھی کر دی ہے۔

سیماب نے محنت کش طبقے سے متعلق جو نظمیں لکھی ہیں ان کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں مزدوروں سے کس قدر محبت و ہمدردی تھی۔ اپنی نظموں روزہ دار اور مزدور، اے سرمایہ دار، سازش، تخریب، جوش انتقام، مزدور اور عزتِ نفس میں انھوں نے اس عہد کے اور اس طبقے کے حالات کی بڑی سچی تصویر کشی کی ہے۔

سیماب کے عہد کا ہندوستان انقلاب انگیز حالات سے گزر رہا تھا۔ معاشرتی وسماجی مسائل اور سرمایہ دارانہ نظام نے لوگوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ سیماب کی ان نظموں میں ہمیں طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دار، زمین دار اور طبقۂ اعلیٰ کے ظلم وستم کو نمایاں کرنے والے اشعار بہ کثرت ملتے ہیں، جو ان کے خیالات واحساسات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے دولت کے نشے میں چور لوگوں کے مردہ احساسات کو بہت کھل کر پیش کیا ہے۔ وہ مظلوم ونادار طبقے کی مفلوک الحال زندگی کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ سیماب کسانوں اور مزدوروں، مفلسوں اور غریبوں کو ظلمت کدہ نے نکل کر لمعات سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے انقلابی آہنگ میں محض گھن گرج نہیں بلکہ مقصد اور مشن کے تئیں پرخلوص پیغام رسانی کا جذبہ کارفرما ہے۔ سیماب نے ثقافت پر مادی مظاہر کے اثرات کو اپنی نظموں کے ذریعہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور معاشرے کی تلخیوں اور زہرناکیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ نظم ''اے سرمایہ دار'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنے ہم جنسوں سے اے منعم نہ وحشت چاہئے — جن کا تو مخدوم ہے ان کی بھی خدمت چاہئے
وہ معاون ہیں ترے، ہمدرد ہیں ہمراز ہیں — حسبِ موقع تجھ کو ان کی بھی اعانت چاہئے
حقِ خدمت ان کا دینا چاہئے دل کھول کر — جو وفا تجھ سے کریں ان سے مروت چاہئے

نالۂ مظلوم بہر انتقام آنے کو ہے
اشتراکیت کا ایک طوفانِ عام آنے کو ہے

سیماب اکبرآبادی جہاں اپنی نظموں میں کسان اور مزدوروں کے استحصال پر آنسو بہاتے ہیں، وہیں ان کے اندر جوش وولولہ پیدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسے مقامات پر ان کی فکر اقبال کی فکر سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم ''جوش انتقام'' ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے اقبال کے مردِ کامل کو نظر میں رکھ کر لکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھا دو چنگ ورباب اپنی بزم عشرت سے — کہ آرہا ہوں میں صد محشر جنوں بردوش
ہے میرے ساتھ پریشانیوں کی اک دنیا — بکائے حشر چکاں و فغان صورِ فروش
مسل کے پھینک دو پھولوں کو، آئینے توڑ دو — ہٹا دو پردۂ رنگین و مسندِ گل پوش
حقیقتوں پہ ہیں آثار تیرگی طاری — سحر نہیں ہے کہ ہو جاؤں مثلِ شمع خموش
مجھے جہان ریا کی جڑیں ہلانی ہیں — ملا ہے اذن تکلم بہ اقتضائے سروش

اب انکشاف کی قوت سے کام لینا ہے
منافقوں سے مجھے انتقام لینا ہے

نظم جوشِ انتقام میں وقار، جوش وولولہ اور بلند آہنگی بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ سیماب کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جو اشترا کی خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جن میں مزدوروں اور کسانوں پر کئے گئے ظلم و جبر کو وہ ایسے پراثر پیرایے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی کسک اور تڑپ ہماری روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ سیماب کو اشترا کی نظام سے اس لئے بھی ہمدردی ہے کہ اس نے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے استحصال اور نسلی وطبقاتی امتیازات کو ختم کرنے کے لئے بڑا کام کیا۔

حسن وعشق ومحبت : اردو شاعری خاص طور سے اردو غزل کا پورا سرمایہ حسن وعشق کے جذبات کے اظہار میں غالباً دوسری کسی بھی زبان کی شاعری کے مقابلے میں فضیلت رکھتا ہے۔ عربی و فارسی کی عشقیہ شاعری کے عظیم الشان ذخیرے سے اردو شعراء نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور واردات حسن وعشق کو بہت سی جگہ ان سے بہتر انداز میں بھی بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو نظم میں تقریباً تمام شعراء نے اس موضوع کو برتا ہے اور عمدہ طریقے پر برتا ہے۔ چنانچہ قلی قطب شاہ سے نظیر اکبرآبادی تک اور نظم جدید کے آغاز سے سیماب کے عہد تک تمام شعراء کے یہاں عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مگر سیماب اکبرآبادی نے عشقیہ شاعری کو ہر نہج پر مفصل ومکمل طریقہ سے اپنایا ہے۔ اور اس میں سنجیدگی کے ساتھ دردمندی پیدا کی ہے۔ ان کا عشقیہ کلام خالص واردات قلب کی پیداوار ہے۔ وہ جو بھی کہتے ہیں محسوسات کی بنا پر بیان کرتے ہیں۔ ان کی انفرادی حیثیت ان کے ایک ایک شعر سے ظاہر ہوتی ہے۔

حسن وعشق کے تاثرات کی پیشکش میں سیماب نے اکثر نظموں میں حسن نسوانی کی مرقع کشی کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر یہ مرقع روایتی ہیں۔ ''کارِ امروز'' کی نظمیں اس کی عمدہ

مثال ہیں۔ مثلاً حسن، ترے ماضی کی یاد، نیا عہد نامہ، گناہِ عشق، عقل و عشق، حسن کو دعوتِ سکون، حسن مجبور، حسن کا آخری حربہ، تم کاش وہی ہوتے، دل کی پیاس، صبح محبت، اے چراغ صبح سن، نزاکت احساس، اساس کائنات، انتظار، صبوحی، دعائے نیم شبی وغیرہ اس نوع کی نظمیں ہیں۔ ان کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شاعر کے جذبات واحساسات اپنی اعلیٰ وارفع شکل میں موجود ہیں۔ ان کی نظم ''تم کاش وہی ہوتے'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کاش تم نہ جاتے خلوت سے خفا ہوکر
فردوس نظر بنتے تسکین وفا ہوکر
احساس سے دوری کے مغموم نہ ہوتا میں
جلووں کے تسلسل سے محروم نہ ہوتا میں
میں جذب تمہیں کر کے اپنے دلِ سوزاں میں
ہر وقت جلا سکتا اک شمع شبستاں میں

تم کاش فلک ہوتے! معمور ستاروں سے
میں تم کو چھوا کرتا نظروں سے اشاروں سے
ہر وقت جواں رہتا مرا دل ناکارہ
ہوتا نہ قیامت تک برہم میرا نظارہ
جس وقت جہاں جاتا تم سامنے آجاتے
محدودِ نظر ہوکر آنکھوں میں سما جاتے

نظم ''تم کاش وہی ہوتے'' میں عشق کے متعلق ان کی قلبی کیفیات اس طرح ظاہر ہوتی ہیں کہ روح کے ذریعہ جسم میں پوری طرح سرایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ سیماب

کے یہاں جسم اور روح کا یہ تعلق متصوفانہ افکار کو بھی تقویت دیتا ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے اپنی فکری اساس کے لئے قدیم مشرقی علوم اور مذہبی عقائد سے ایسے عوامل تلاش کر لئے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا تخلیقی سفر انفرادی طور پر جاری رکھ سکیں۔

اردو شاعری میں سب سے پہلے غالبؔ نے کہا تھا کہ حسن و جمال کا خیال بھی ایک طرح حسنِ عمل یا نیک کرداری ہے۔ اس طرح انھوں نے روائتی سکون اور جمہوری تصور کو حرکت اور عملیت کی دنیا سے آشنا کرایا۔ مثلاً غالبؔ کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

بہرحال غالبؔ کا تو یہ خیال ہے کہ حسن پرستی کا آخرت میں وہی صلہ ملا جو نیکی اور حسن کا ملتا ہے تو وہ خسارے میں نہیں رہے۔ سیماب اکبرآبادی نے حسن و عشق کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بھی قابلِ صد تحسین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن اپنے حدود میں محدود اور مجبور ہے۔ برخلاف اس کے عشق حدود کا پابند نہیں۔ وہ دیوانہ اور صحرانورد ہے اور آزادی اس کی سرشت ہے۔ حسن کی راہیں الگ ہیں اور عشق کی راہیں جداگانہ ہیں۔ بقول ان کے۔

حسن محوِ احتیاط و عشق آزادی شعار

ان کا خیال ہے کہ حسن حدود کا پابند اور عشق میں آزادیاں مضمر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسن اس کو ملتا ہے جس کو آزادیاں نصیب ہوتی ہیں۔ جس کی روح میں حقیقت کی تلاش ہوتی ہے وہ حسن کو آزاد رہنے کے لئے مجبور کرسکتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''حسن مجبور'' اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے۔

حصۂ انسان ہے سوز و ساز کے سامان میں　　حسن بھی انسان میں ہے عشق بھی انسان میں

حسن نے آنکھیں جھکا کر کیں یہ زنجیریں قبول　　بڑھ گیا افسانۂ رنگیں میں عنوانِ فضول
عشق، آزاد اور مجروح رواسیم پائے حسن　　حسن خود توہین ہے اپنے لئے اے وائے حسن
حسن اسے ملتا ہے جو لذت آشنائے عشق تھا　　جس کا دل دنیا میں فطرت آشنائے عشق تھا
حسن اسے ملتا ہے جیسے آزادیاں ہوتی نصیب　　ہر قدم پر کائنات ایجادیاں ہوتی نصیب
حسن اسے ملتا ہے جسے ہوتی محبت کی تلاش　　اور جس کی روح کو ہوتی حقیقت کی تلاش
حسن محوِ احتیاط و عشق آزادی شعار　　ذوقِ حسن و عشق میں ہے اختلاف ناگوار

اے محبت، عشق کے دل سے یہ کاوش دور کر
حسن کو آزاد رہنے کے لئے مجبور کر

سیماب کی اس نوع کی دوسری نظمیں مثلاً عقل و عشق، گناہ عشق، صبح محبت، حسن، تیرے ماضی کی یاد وغیرہ نظموں میں جذبۂ عشق اختیاری نہیں بلکہ اضطراری کیفیت میں نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''گناہِ عشق'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خالق بحر و بر ہے عشق، مالکِ خیر و شر ہے عشق　　کہتے ہیں سب جسے خدا، کوئی نہیں مگر ہے عشق
عشق وہ ہی تو برق ہے جس کی تڑپ ہے روح میں　　گرم ہے قلب کائنات، جس سے وہ ہی شرر ہے عشق
عشق کے دم سے ہے شور و سکوں کا سلسلہ　　رونق انجمن ہے عشق، گرمی رہگذر ہے عشق
ہے یہ متاع جاوداں، جنس وفا یہی تو ہے　　سود و زیاں سے بے نیاز دولت بے خطر ہے عشق
ہیں یہ دل و جگر فصول عشق اگر نہ ہو نصیب　　دل کی حیات عشق ہے زندگیٔ جگر ہے عشق

سیماب حسن و عشق کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی توضیح و تشریح بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ حسن پرستی کو حقیقت آگہی کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ایک عارف کی حقیقت شناس نظر اور قلبِ بتاں دونوں مل کر اس شاہد حقیقی کے جلوے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سیماب کے یہاں حسن و عشق کی واردات کی رمزیت نہایت لطیف نظر آتی ہے۔ اس نے

محبوب کو پتھر کی مورت نہیں سمجھا بلکہ اسے دل سے بھی تسلیم کیا ہے۔

بہر کیف عشق ایک فطری جذبہ ہے اور یہ ہماری شاعری میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کا کلام حسن و عشق کے جذبات سے خالی ہو۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''جس طرح انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔''[۱]

سیماب نے حسن و عشق جیسے موضوعات پر جو نظمیں لکھی ہیں ان کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس موضوع کو اس صنف میں بیان کرنے پر بھرپور قدرت رکھتے تھے۔ وہ حسن کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے تھے اور بدلتے ہوئے زمانے اور انقلاب دہر کا احساس زیادہ رکھتے تھے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی نے اپنی دوسری نظم ''عقل و عشق'' میں عقل و عشق کی کشمکش کا احاطہ کیا ہے۔ یعنی عقل مصلحت اندیشی اور احتیاط کے معنی میں اور عشق اس والہانہ محبت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جو آدابِ مصلحت سے ناآشنا اور وضعِ احتیاط سے یگانہ ہے۔ نظم عقل و عشق سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کہ مے بازی بہ سازِ مغربی — زیر کی و عشق، عشق و زیر کی
زیر کی در عشق عین گمرہیت — بر حواس نو، اساس زندگیست

۱۔ یوسف حسین خاں، اردو غزل، ص ۱۰۳

عشق چوں بازیر کی محکم شود　　کائناتِ عاشقی، برہم شود
تو وصد تعلیم عشق وزیر کی　　ماؤ ناز عشق و ساز بے خودی
بے خودی ما را خدا آموز شد　　شام ما قبل سحر نو روز شد
تو وخود بینی کہ خوئے ناکس است
ما خدا نبیم، مارا ایں بس است

علامہ اقبال کی طرح سیماب بھی عقل کو عشق کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ نظم عقل وعشق ان کی اسی طرح کی نظم ہے۔ اس میں وہ خودی کا پیغام نہیں دیتے ہیں بلکہ بے خودی کی تعلیم دیتے ہیں جس پر اساس کائنات قائم ہے۔ ان کے عقیدے میں راز حیات محبت میں مضمر ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت نہ ہوتی تو عالم کا نظام درہم برہم ہوجاتا۔ بقول سید حامد علی نقوی مالپوری:

''وہ حسن وعشق کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی توضیح و تشریح کرتے ہیں حسن پرست ہیں اور مجرم ذوق عشق، حسن وعشق میں رابطہ بتاتے ہیں وہ حسن پرستی کو حقیقت آگہی کا مترادف سمجھتے ہیں۔''[۱]

حسن وصداقت اور محبت سیماب کی تمام نظموں کا نصب العین ہے۔ سیماب کہتے ہیں کہ دنیا کی اساس ہی محبت پر ہے۔ دنیا کو محبت کا درس دو تم اپنی جنت زمین پر ہی تیار کرلوگے۔ انھوں نے جذبۂ محبت سے معمور ہوکر ''نزاکت احساس'' کا جو نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ ہو:

مرا احساس جو تاروں کی کرنوں سے بھی نازک ہے　　جو نازک فکر شاعر کے خیالوں سے بھی نازک ہے

۱۔ حامد علی نقوی، شاعر، کارِ امروز نمبر، جولائی ۱۹۳۵ء، ص ۴۱

لطافت جس کی پچھلی رات کے پھولوں میں پلتی ہے　　جو وقتِ صبح بوئے گل کی موجوں میں نکلتی ہے
گوارا اس کو ہوگی چوٹ کیونکر نشترِ غم کی　　حقیقت جو رگِ گل کی ہو اور فطرت ہو شبنم کی
مرا احساس آب و رنگ کی گرمی بڑھاتا ہے　　جبینِ حسن میں احساس میرا مسکراتا ہے
پذیرائی مرے احساس کی اے حسنِ فانی کر　　بسر اس کی پناہوں میں شبابِ زندگانی کر

نظم ''نزاکت احساس'' میں سیماب نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کا بہت اہم کارنامہ ہے۔ وہ الفاظ کی مدد سے اپنی نظموں میں خواب ناک فضا کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ فضا قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے فن کی ایک بڑی خصوصیت ان کی مینا کاری ہے۔ ان کی نظموں کی فنکارانہ تعمیر کو دیکھ کر تاج محل کی نفاست، نزاکت، پاکیزگی اور مینا کاری کا احساس ہوتا ہے۔

غرض اپنی نظموں میں سیماب نے عشق و محبت جیسے روایتی موضوع کو اس قدر دلنشیں اور متنوع انداز میں پیش کیا ہے کہ کبھی کبھی موضوع کے اچھوت ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے اور یہ ان کی زبردست قدرت کلام کی دلیل ہے۔

منظر نگاری : منظر نگاری کے سلسلے میں ہمارے ناقدین ادب نے مختلف انداز فکر سے کام لیا ہے۔ ہر شخص نے اپنے طور پر اسے سمجھا اور برتا ہے۔ کسی نے فطرت نگاری کو منظر نگاری تصور کیا ہے اور کسی نے نیچرل شاعری کو۔ یوں تو اردو کے سبھی شعراء نے شروع سے ہی نیچر کو گلے لگایا ہے۔ البتہ یہ وصفِ خاص قلی قطب شاہ، نصرتی، ولی، نظیر، سودا، میر و انشا، ذوق و غالب، مومن، سرور جہاں آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، انیس و دبیر، آزاد و حالی، اقبال و چکبست اور سیماب کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ اگرچہ سیماب، انیس و اقبال جیسی منظر نگاری کرنے سے تو قاصر رہے ہیں، لیکن اکثر اوقات ان کے کلام کے مطالعے سے

محسوس ہوتا ہے کہ ایک مصور برش سے تصویر کھینچتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے فطرت کو قریب سے دیکھا ہے اور فطرت کی کیفیات کو اپنے قلب ونظر میں اتارا ہے۔ مثلاً وہ اپنی نظم ''شاعرِ امروز'' میں فطرت کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں:

شام کی تصوری کھینچی ہے سحر کے نور سے　　تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کافور سے
چاند کی کرنوں سے کیا تو ہو چکا ہے ہم کلام　　ساغر خورشید میں پی ہے شراب لالہ فام
لرزشِ شبنم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا　　طرح کا مصرع کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا

سیماب کی شاعری میں مناظرِ فطرت کے معیاری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نزول انسان، آئینہ افق، بچمن درآ، صبح صادق، صبح کا چاند، میرا ہم خرام شب، چراغ ساحل، تاج کنار شفق میں، صبح تاج، تاج شب تاریک میں، چاند اور تاج وغیرہ نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب منظر نگاری کی زبردست قوت اور قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جس منظر پر قلم اٹھایا ہے، اس کو حیات نو بخشی ہے۔ اس ضمن میں سید حامد علی نقوی رقمطراز ہیں:

> ''مولانا مناظر فطرت کی تصویر کھینچنے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ وہ فطرت کے پرستار حقیقی ہیں اور فطرت ہی ان کا مذہب ہے۔ وہ صحیفۂ فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ کائنات کے ذرے ذرے میں ان کو حسن نظر آتا ہے اور وہ حسن لافانی کو وجہ قیام عالم سمجھتے ہیں۔ ان کا قلب رموزِ قدرت کا مخزن ہے۔ وہ حسن وعشق کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی توسیع وتشریح کرتے ہیں۔ حسن پرست ہیں اور مجرم ذوق عشق، وہی حسن وعشق میں

رابطۂ سرمدی بتاتے ہیں، وہ حسن پرستی کو حقیقت آگہی کا مترادف
سمجھتے ہیں۔''[۱]

سیماب نے اپنی نظم ''فطرت کی جوگن'' میں فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔ ان کی یہ منظر نگاری بہت واضح اور دلکش ہے۔ ملاحظہ ہو:

عروج شب ہائے ماہ کا ہے ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروس شب بے حجاب ہو کر تجلیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے دھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
برس کے بادل ابھی کھلے ہیں فضا میں خنکی بتا رہی ہے
پہاڑ جنت بنے ہوئے ہیں محیط ہے نور چوٹیوں پر
کرن جو ہے آبروئے چشمہ وہ آئینے سے بنا رہی ہے
ہے دور میں چاند کا پیالہ، افق پہ پھیلی ہوئی ہے مستی
رواں ہے یوں آبشار، گویا شراب فطرت بہا رہی ہے
تلاطم رنگ و بو میں، کیفِ نظر ہے اک پر شباب جوگن
جو اپنے ماحول کی خموشی میں زندگی بن کے چھا رہی ہے
قریبِ چشمہ سجائے بیٹھی ہے مرگ چھالے پر اپنی دنیا
کوئی تو ہے چاند میں یہ جس سے نشیلی نظریں لڑا رہی ہے
ادھر ہے اک آبشار لرزاں، ادھر ہے زلفِ رسا پریشاں
وہ اپنی موجیں دکھا رہا ہے، یہ اپنی موجیں دکھا رہی ہے

۱۔ حامد علی نقوی، شاعر، کارِ امروز نمبر، جولائی ۱۹۳۵ء، ص ۴۱

اس نظم میں سیماب نے مناظرِ فطرت کی عکاسی نہایت واضح اور روشن انداز میں کی ہے۔ یہ حسین مناظر اور ان مناظر میں ایک جوگن مرگ چھالے پر بیٹھی ہوئی ہے، اس کو نہ دنیا کی فکر ہے اور نہ عقبیٰ کا ہوش ہے بلکہ یادِ خدا میں محو ہے۔ سیماب کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ اپنے فلسفیانہ تخیل کا سہارا نہیں لیتے ہیں وہاں ان کی عقبی زمین زیادہ روشن اور تابناک معلوم ہوتی ہے۔ جہاں ان کے خیالات میں کچھ فلسفیانہ چھاپ ہوتی ہے وہاں ان کی عقبی زمین دھندلی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کی دوسری نظم ''ہلال رمضان اور بسنت'' ہے جس میں انھوں نے ہلال کی تصویر کشی کی ہے۔

ہلال ماہ رمضان آسمان پر سرنگوں نکلا ۔ بسنتی پیرہن میں بے قرار و بے سکوں نکلا
اسے ترکوں کے چہرے کی طرح گلرنگ ہونا تھا ۔ اسے ایرانیوں کی طرح شوخ و شنگ ہونا تھا
بسنت اس کی شعاعِ نور سے رنگین ہو جاتی ۔ گھڑی بھر کے لئے نظارے کی تسکین ہو جاتی
یہ مغرب سے اٹھا تھا چلبلا پن کیوں نہیں اس میں ۔ بتانِ مغربی کا رنگ و روغن کیوں نہیں اس میں
اگر بیدار کرنا تھا تقدس ماہ رمضان کا ۔ تو ہوتا ابروئے حورِ ارم انداز عنوان کا
پیام صوم دے کر پھر افق میں ہو گیا پنہاں ۔ چمکتے ہی اندھیرے کے عمق میں ہو گیا پنہاں

سیماب نے نظم ''ہلال رمضان اور بسنت'' میں اگرچہ ہلال کی تصویر کشی کی ہے لیکن سیماب کے یہ اشعار ہلال کی اچھی اور عمدہ منظر کشی کرنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد سیماب میں قصد، آورد اور تصنع زیادہ ہوتا ہے۔[۱] چونکہ سیماب صاف سادہ اور سلیس الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے جس کے سبب منظر نگاری کی تصویر ان کے یہاں دھندلی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس ''فطرت کی جوگن'' میں ان کی منظر کشی تابناکی کے ساتھ روشن ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ سیماب نے یہاں آورد اور تصنع کو

۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، حصہ دوم، ایوانِ اردو، پٹنہ، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۶

زیادہ نہیں برتا ہے۔

سیماب نے اپنی بعض نظموں میں فطرت کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے۔ چونکہ انھوں نے فطرت کی مصوری فطرت کی خاطر بہت کم کی ہے جس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اقبال کی طرح فطرت کے ذریعہ عوام الناس تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں اس لئے منظر نگاری کی طرف انھوں نے بہت کم توجہ صرف کی ہے۔ البتہ انھوں نے اپنی نظموں میں منظر نگاری سے سرور و کیف ضرور حاصل کیا ہے۔ ان کی نظم ''صبح صادق'' سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے کیف بادۂ صبح ہے، تجھے لطف خواب سحر میں ہے
وہ کہاں ہے تیرے خیال میں، جو بہار میری نظر میں ہے
کبھی میری بزم سحر میں آ، تجھے میں دکھاؤں وہ آئینہ
جو تجلیوں سے گھرا ہوا، میری چشم جلوہ نگر میں ہے
یہی لمحہ صبح ظہور ہے یہی لحظہ مشرق نور ہے
عجب انتظام سرور ہے کبھی دل میں ہے کبھی سر میں ہے

اسی ضمن میں ان کی دوسری نظم ملاحظہ ہو:

ابھی راہ میں ہے عروس شب، ابھی گرم محفل ناز ہے
ابھی پر پڑے ہیں جلے ہوئے، ابھی شمع صرف گداز ہے
ابھی ہوش تشنۂ ہوش ہے، ابھی ہیں سکوت میں شورشیں
ابھی کائنات خموش ہے ابھی بے صدا لبِ ساز ہے

سیماب اپنی نظر میں صبح کو ایسا تصور کرتے ہیں جیسے شراب۔ اسی وجہ سے انھوں نے

بادۂ صبح کی ترکیب استعمال کی ہے۔ ان کو بادۂ صبح میں ایک خاص قسم کا سرور و کیف ملتا ہے۔ ان کو صبح سے بہار کے جلوے بھی ملتے ہیں اور یہ صبح آئینہ کی تجلیوں سے گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کبھی دل میں سرور پیدا کرتی ہے اور کبھی سر میں۔ سیماب نے ان اشعار میں فطرت سے مسرت اندوزی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ بقول سید سعید احمد:

''ان کی جیسی منظر نگاری کی مثالیں اردو شاعری میں خال خال نظر آتی ہیں۔'' [۱]

سیماب نے جہاں فطرت نگاری سے سرور و کیف حاصل کیا ہے وہیں انھوں نے فطرت سے انسان کو پیغام دیا ہے کہ فطرت بھی انسان ہی کی طرح گفتگو کرتی ہے اور کائنات کے راز کی گرہوں کو کھولتی ہے۔ ''تاروں کا گیت'' اسی قبیل کی نظم ہے۔

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں، ہم جنت کے پروانے ہیں
لبریز شرابِ فطرت سے بے گردش کے پیمانے ہیں

مضراب نگاہِ فطرت ہے، مہتابِ رباب زریں ہے
ان نغموں کی بوچھاروں سے یہ ساز ہستی رنگین ہے

اے دنیا کے رہنے والو، تم کیوں مغموم پستی ہو
ہم بھی اُس کی آبادی ہیں تم جس دنیا کی بستی ہو

تم میں ہم میں کچھ فرق نہیں، مخلوق خدا کی دونوں ہیں
وابستہ ایک ہی رشتے سے یہ نوری خاکی دونوں ہیں

ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم ہنستے ہیں تم روتے ہو
ہم جاگتے رہتے ہیں شب بھر تم غافل ہو کر رہتے ہو

۱۔ مضمون سیماب اکبرآبادی۔ ایک شاعرِ انجمن، سید سعید احمد، شاعر، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۶۲

اس نظم میں تارے مختلف مقامات سے گردش کے ساتھ ساتھ انسان سے کہتے ہیں کہ دنیا سے غافل ہوکر سونا محرومی کی نشانی ہے۔ سونے والا کبھی دنیا میں ترقی اور فلاح و بہبود حاصل نہیں کرسکتا اور نہ کائنات کے رازوں کو سمجھ سکتا ہے۔ آگے چل کر اسی نظم میں یوں لکھتے ہیں:

اے غافل انسان جاگ کبھی، ہم سے فیض روحانی لے
جانِ محزوں کی تسکین لے، غمگین دل کی تابانی لے
اے غافل انسان جاگ کبھی بے مانگے دولت لٹتی ہے
تو وقت گنواتا ہے سو کر اور شب بھر نعمت لٹتی ہے
اے غافل انسان دیکھ کبھی، پچھلے کو کیا کچھ ہوتا ہے
فطرت ملنے کو آتی ہے اور تو بے پروا سوتا ہے
اے غافل انساں سوچ کبھی، یہ راز نہیں آئینہ ہے
وہ موت کو خود کیوں دعوت دے، جس کو دنیا میں جینا ہے
یہ گیت ہے، وحیِ عرشِ خدا، الہام کی صوتِ راز ہے یہ
جس ساز کا تو اک پردہ ہے اس کی رنگیں آواز ہے یہ

نظم ''تاروں کا گیت'' میں سیماب نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تارے بھی انسان سے گفتگو کررہے ہیں۔ گویا انسان کی طرح تارے بھی ذی روح ہیں۔ تارے اپنی گفتگو کے ذریعہ انسان کو بیداری کا پیغام دیتے ہیں اور سعی و عمل کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ غرض سیماب اکبرآبادی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اور فطرت کوئی جداگانہ چیز نہیں ہے بلکہ باہم لازم وملزوم ہیں، کیونکہ دونوں ایک ہی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ اسی لئے وہ انسان کو فطرت کے مطالعہ کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ چونکہ مطالعہ

فطرت اسرار الٰہی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے انھوں نے انسان کی توجہ کا مرکز فطرت کو بنایا ہے تا کہ فطرت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے کہ فطرت خدا کی ذات کا آئینہ ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''بچمن درآ'' ملاحظہ ہو:

دیکھ وقت صبح گلہائے شگفتہ کی شفق — آئینہ ہے بزم فطرت کا ہر اک رنگین ورق
دیکھ کلیوں کی صبوحی میں شراب لالہ فام — صبح کے رنگوں سے اس کے ڈھالنے کا اہتمام
دیکھ پھولوں کی رگوں میں زندگی چڑھتی ہوئی — وقتِ بالیدگی سے تازگی بڑھتی ہوئی
دیکھ کلیوں کی تنک تابی سے رس بہتا ہوا — نورِ فطرت آشیاں سے تا قفس بہتا ہوا
دیکھ شاخوں میں خم محراب طاعت کی ادا — جھوم کر ہر بار جھکنے میں محبت کی ادا
دیکھ بزم رنگ و بو کو غور کی نظروں سے دیکھ — کیا عیاں ہوتا ہے ان مہکے ہوئے جلوؤں سے دیکھ
اکتساب کیف کر کے اس تجلی زار سے — قلب کو معمور کر لے دولتِ اسرار سے

سیماب کو نظم ''بچمن درآ'' کے ہر غنچہ وگل سے بادۂ اسرار چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فطرت کو پیغام الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال یوں کہا جا سکتا ہے کہ سیماب کی وضاحت میں رمزیت اور رمزیت میں وضاحت پوشیدہ ہے۔ ان کی زبان کا تخلیقی حسن، تشبیہوں، استعاروں، علامتوں اور پیکروں کی صورت میں خاص طور سے واضح ہوتا ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے عام زندگی سے ماخوذ ہیں جو خاص طور سے ان کے اسلوب کو بڑی حد تک دلکش اور پسندیدہ بناتے ہیں۔ سیماب کی مندرجہ بالا نظم ''بچمن درآ'' ان کے اسلوب کی بیشتر خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں الفاظ کی بندش اور ان کا پرکشش استعمال، اوزان و بحور کی دلکشی، بندش کی چستی، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت وغیرہ موجود ہونے کے باوجود اس نظم کی فضا نیم دھند اور نیم شفاف معلوم ہوتی ہے۔

فطرت نگاری کی حامل نظموں میں سیماب کی نظم ''تاج کنار شفق'' بہت اہمیت کی

حامل ہے۔اس نظم میں فکری وفنی وسائل کوانھوں نے بہت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔نظم ''تاج کنارِشفق'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

افق کے لالہ زار سے گزر رہا ہے آفتاب — فضاؤں کو سلام شام کررہا ہے آفتاب
طلائی تھال میں شفق سجا کے لائی شام کو — سکونِ منظر و نظر بناکے لائی شام کو
گلو کے قمقمے جلے، کنول جھکا ہوا اٹھا — شفق ہوئی جو رنگ بار ''تاج'' جگمگا اٹھا
قدح یہاں، سبو یہاں، بہار چارسو یہاں — سمٹ کرآ گیا ہے اک جہان رنگ و بو یہاں
ادھر شفق کی شعلہ تابیاں بنفشہ زار میں — ادہر ریاضِ تاج رنگ و نور کی کنار میں
ہجوم رنگ و بو میں ہے، تجلی دوام بھی — کرشمہ ہے یہ تاج کا کہ صبح بھی ہے شام بھی
جھلک نقابِ شام میں ہے لیلیٰ بہار کی — چمک نمودِ تاج میں ہے لعلِ شاہوار کی

چمک رہا ہے ''تاج'' بھی شگفتہ ہیں گلاب بھی
ہیں قائم ایک ہی جگہ شفق بھی آفتاب بھی

الغرض کارِامروز میں پیش کردہ فطرت نگاری سے معمور شاعری بہت اہمیت کی حامل ہے۔سیماب کے کلام میں فطرت نگاری بہت حسین اورفنی محاسن کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ انھوں نے فطرت کومختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا ہےاور پیغام رسانی کے لئے اسے بطور پس منظر بھی استعمال کیا ہے۔

''ساز و آہنگ''

علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا مجموعہ ''ساز و آہنگ'' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کے باب اول ''نوائے عصر'' میں قومیت، سیاست اور وطنیت پر نظمیں شامل ہیں۔ باب دوم میں ''صلائے تہذیب'' کے زیرعنوان مذہب، اخلاق، معاشرت پر اور باب سوم میں ''حدیث ادب'' کے تحت شعر و حکم پر نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ باب چہارم میں ''سرودِ روح'' کے عنوان سے سیماب نے معتقداتی نظمیں لکھی ہیں اور باب پنجم میں ''نغمۂ معصوم'' کے نام سے بچوں کے اخلاق کی اصلاح کے لئے عام اور سلیس زبان میں نظمیں لکھی ہیں۔

ساز و آہنگ کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی نظموں میں سیماب کی سوچ اور فکر میں تبدیلی رونما ہوئی ہے تاہم ساز و آہنگ کی نظموں اور اقبال کی ''بانگ درا'' کی نظموں میں خاصی مشابہت ملتی ہے۔ سطور ذیل میں ''ساز و آہنگ'' کے ابواب کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

باب اول۔ نوائے عصر: قومیت، سیاست، وطنیت

باب اول میں نوائے عصر کے زیرعنوان قومیت، سیاست اور وطنیت پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ چونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پورا ہندوستان فکری، تہذیبی اور تمدنی سطح پر مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار سے دوچار ہوا تھا اور ساٹھ ستر سال کے عرصہ میں اس کے اثرات و نتائج نے ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ سیماب نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور اپنی نظموں کے ذریعہ سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی

کوشش کی۔ یہ نظمیں زیادہ تر سیاسی حالات پر مبنی ہیں۔ان کے ذریعہ سیماب نے انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی سیاسی جدوجہد کو تیز کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔اس دور میں سیماب کے یہاں قومی وملکی تعمیر کا جوش زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ اقبال سے بہت متاثر ہوئے اور بہت سی جگہ ان کی تقلید کی کوشش کی ہے۔

سیماب نے اپنے سیاسی مقاصد کی اشاعت اور ملک وقوم کی خدمت کے جذبے کے تحت ۱۹۲۹ء میں ایک ہفت روزہ اخبار ''تاج'' جاری کیا جو ان کے سیاسی اور ادبی افکار و خیالات کا ترجمان تھا۔انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے سیاسی رجحانات اور عقائد کا اظہار کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

پھر از سر نو اجڑی دنیا کو بسا لوں میں
اس ساز کے نغموں سے مردوں کا جگا لوں میں

سیماب نے اپنی قومی، سیاسی اور وطنی نظموں میں بھی دوررس پیغام دیا ہے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا اور اس میں صور سرافیل پھونکنا چاہتے ہیں۔

ساز وآہنگ کے باب اول میں ہندوستان، اذانِ ہمالہ، صبح آزادی کا گیت، ایشیاء، وطن، ہندوستانی نوجوانوں، کہ ہم ہندوستانی ہیں، قومی ترانہ، بہ نژادنو، صنم کدہ جمہوریت، دعوتِ انقلاب، نوحۂ وطن، سیاسی قیدی، کارزار فسلطین، اے اسیرانِ وطن، تشدد اور عدم تشدد، مجلسِ اقوام، امن وجنگ، قدم بڑھائے چلو وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔نظم ہندوستان ان کی ایسی نظم ہے جس میں انھوں نے ملک کے حسین ماضی کو یاد کرتے ہوئے حال کی نوحہ گری اور مستقبل کے بارے میں سوچنے کی رغبت دلائی ہے۔

یہ نظم سیماب کے سیاسی اور تاریخی شعور کا عمدہ نمونہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آہ اے ہندوستان! یہ تیری پستی وہ شباب
کچھ تری تقدیر ہی میں فطرتاً ہے انقلاب

گو بظاہر تو نشاطِ ندرت ایام ہے
فی الحقیقت بے سکوں، بے چین، بے آرام ہے

وہ بہاریں وہ چمن وہ گلشن ایجادی کہاں
اے غلام آباد، اب وہ تیری آزادی کہاں

بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار
ایک ذرے ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار

اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساط ماہتاب
تیری موجِ خاک سے اب بھی برستی ہیں گلاب

روح سے خالی ہے لیکن پیکر مردہ تیرا
جلوہ پژمردہ ہے تیرا، باطن افسردہ ترا

جیسے شمعِ صبح محفل، جیسے چھپتا آفتاب
جیسے شاعر کا بڑھاپا اور بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پیرایۂ آغاز دے
کاش مستقبل تیرا ماضی کو پھر آواز دے

سیماب کی دیگر نظموں میں ایشیا بھی بے حد مقبول ہے، جس میں مقدس سرزمین پر فخر کرنا، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہونا، اس کی عظمتِ رفتہ کا اظہار اور خستہ حالی پر ماتم کرنا اور انقلاب نو کا پیغام دینا یہ سب ان کی وطن سے بے پایاں محبت کی دلیل ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان کا وطن ہندوستان ہے اور ہندوستان ایشیا کا ہی حصہ ہے۔ نظم ایشیا میں سیماب کہتے ہیں:

مشرق فطرت ہے یہ فطری مناظر ہیں یہاں
جلوۂ در پردہ کے لاکھوں مظاہر ہیں یہاں

زندگی آتی ہے لینے ان سے تعلیم حیات
منزل ہستی سے واقف سب مسافر ہیں یہاں

وسعت رنگ ونوا فردوس در فردوس ہے
کتنے ساماں باعثِ تسکین خاطر ہیں یہاں

ارتقا انگڑائیاں لیتا ہے اس اقلیم میں
آئینے خورشید بن جانے پہ قادر ہیں یہاں

گرم بازاریٔ عہد رفتہ پھر ہونے کو ہے
زندگی کی موجزن چنگاریاں پھر ہیں یہاں

انقلابِ نو بدلنے کو ہے رخ تقویم کا
ایشیا پھر ''تاج'' بن جائے گا ہفت اقلیم کا

ملک کی سیاسی فضا، حالات وحادثات اور انقلاب سے ایک فطری شاعر کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ ساز وآہنگ کی نظموں میں انہیں حالات کا ذکر ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی رہنمایانِ ملک کی جدوجہد آزادی کی داد بھی دی گئی ہے اور نوجوانانِ وطن کو درسِ عمل بھی دیا گیا ہے۔ وہ ایک اہلِ علم، شاعر، دردمند اور حساس انسان کی حیثیت سے ملک کی ترقی و آزادی اور عوام کی خوشحالی کے متمنی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت لوگوں اور خاص طور پر نوجوانوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً

پھر از سر نو اجڑی دنیا کو بسا لوں میں
اس ساز کے نغموں سے مردوں کا جگا لوں میں

وہ نظم ''قدم بڑھائے چلو'' میں اہل وطن کو اس طرح آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں:

ہوں لاکھ مشکلیں پیدا قدم بڑھانے میں　　فلک رہے تمھیں مصروف آزمانے میں
بلا سے برق کا مسکن ہو آشیانے میں　　بلا سے زلزلے آتے رہیں زمانے میں
مگر ثبات میں لغزش نہ آنے پائے چلو
قدم بڑھائے چلو!

یہ سب مصیبتیں وقتی ہیں راہِ مشکل کی　　یہ مصلحت ہے کہ رو کے رہو تڑپ دل کی
ہے روشنی انھیں بربادیوں میں محفل کی　　وہ سامنے نظر آتی ہے شمع منزل کی
ہے دل میں سوز تو منزل سے لو لگائے چلو
قدم بڑھائے چلو!

پروفیسر عبدالقادر سروری سیماب کی قومی اور وطنی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے

ہیں کہ:

''سیماب کے لئے شاعری زندگی کا مشغلہ ہے، اس پر ان کی طبیعت کی روانی مستزاد ہے.....اخلاقی وسیاسی ہدایت کاری ان کے خاص موضوع ہیں..... بیان کی لطافت اور تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت سیماب کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ شکوہ الفاظ کے لحاظ سے وہ غالب واقبال تک پہنچ جاتے ہیں لیکن جذبات میں گہرائی نہیں ملتی ہے۔'' [۱]

اسی ضمن میں وہ مزید آگے لکھتے ہیں:

''قومی شاعری میں سیماب کے پاس کبھی رجز ہے کبھی حسی خوانی اور کبھی دلاسا اور کبھی خوش آئند مستقبل کا ترانہ وہ ترقی پسند تحریک کے حامی ہیں۔ لیکن نوجوانوں کے بے شعور شغف اور خواہمخواہ کی بغاوت آمادگی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ الفاظ کا شکوہ اور دربست، فقروں کی چستی اور برجستگی اور ترکیبوں کی تراش خراش میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔'' [۲]

سیماب نے اقبال کی وطنی نظموں کے تتبع میں بھی چند نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں ہندوستان، اذانِ ہمالہ، قومی رجز، وطن، قومی ترانہ، ہندوستان کا پیغام، خسرو برطانیہ کے نام،

۱۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص ۷۷

۲۔ ایضاً، ص ۷۸

یوم آزادی، اے جوانانِ وطن، نوحۂ وطن، اے وائے وطن صدائے وطن، اے اسیران وطن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

باب دوم۔صلائے تہذیب

ساز و آہنگ کے دوسرے باب کی نظمیں مذہب، اخلاق اور معاشرت پر مشتمل ہیں۔اس میں سیماب کے قلم کی جولانی اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ سیماب کی یہ نظمیں اہم پیغام کی حامل ہیں۔ وہ تعمیری پیغام رکھتے ہیں اور جمود کی منزل پر کھڑی اپنی قوم اور اپنے اہل وطن کا جائزہ لیتے ہیں۔ان کی نظموں میں روحِ عصر پائی جاتی ہے۔ان میں انسان دوستی اور خلوص کا پرتو صاف طور سے نظر آتا ہے۔ سیماب عوام پسند شاعر ہیں، ان کی روح اور ان کے تخیل میں ہندوستان کی محبت رچی بسی معلوم ہوتی ہے۔ وہ قدم قدم پر یہاں کے حسین مناظر، باغ، گل وگلزار، دشت وکہار اور آب ورواں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

وہ ہندوستانی مزاج کے شاعر ہیں۔ان کے یہاں اسلامی مذہبی روایات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی روایات کا بھی حسین امتزاج ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ گنگ وجمن کی لہریں اور ان کا ترنم سیماب کے کلام میں روانی سی پیدا کر دیتا ہے۔اس ضمن میں ان کی نظم دیوالی سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا رنگ ونور ایوان ہستی عشرت فروز ذہن ونظر ہے!

ہر در پہ شمعیں، ہر سر میں مستی، گھر گھر چراغاں گھر گھر اجالا

لیکن یہ قیدِ ظاہر پرستی تہذیب باطن ممکن نہیں ہے

پیکر ہو ترا کتنا ہی روشن پہنچے گا دل تک کیونکر اجالا

ہے انتظارِ نور حقیقت روشن ہو جس سے شام ابد تک

تسکینِ دل کا ساماں نہیں ہے، ظلمت ہمیشہ، دم بھر اجالا

پیشِ تصور دنیا ہے، ایسی راتیں بھی جس کی مطلق سحر ہوں

یوں تو بہ فیضِ ذوقِ تماشا ہوتا رہا ہے اکثر اجالا

اے دستِ فطرت! بہر بصیرت دل میں جلا دے شمع محبت

یہ کیا طلسمِ انور و ظلمت، اندر اندھیرا باہر اجالا

سیماب اکبر آبادی کی نظم دیوالی میں جہاں ان کے قلم کی چمک دکھائی دیتی ہے وہیں ان کی دوسری نظم میری ہولی بھی اسی رنگ میں رچی بسی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

کاش حاصل ہو حقیقی زندگی کا ایک دن

سرخوشی کا ایک لمحہ، یا خوشی کا ایک دن

روح ہے ہنگامہ باطل سے گھبرائی ہوئی

ہر طرف ہے سرد مہری کی گھٹا چھائی ہوئی

اب بھی بنتا ہے یہاں در پردۂ جنگ و جدال

خاک انساں ہے عبیر اور خونِ انسان سے گلال

ہے جنوں یہ خاک و خوں سے کھیلنا ہولی نہیں

مدعا ہے انتقام اس سے مرا، ہولی نہیں

ایک نئی دنیا کی خلقت ہے میری تخیل میں

جو معاون ہو سکے انسان کی تکمیل میں

اہتمام زندگی جس میں بطور خاص ہو

آسمان جس کا محبت ہو زمین اخلاص ہو

از سرِ نو پھر مرتب ہو جہانِ رنگ و بو
خار و خس سے پھر ہو پیدا کاروانِ رنگ و بو
عرش سے برسے عبیر و رنگ تخت و تاج پر
اوج پر انسان ہو، انسانیت معراج پر
بربریت کا تفوق، شخصیت کا اعتلا
ہو نیاز آگینیٔ اخلاق سے بدلا ہوا
ارتقا کے رنگ سے لبریز جھولی ہو مری
انقلاب ایسا کوئی ہولے، تو ہولی ہو مری

اسی طرز میں سیماب کی دوسری نظم چراغانِ بہار ہے۔ اس میں بھی حب وطن سے متعلق متاثر کن اشعار کا ایک سلسلہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہیں وطن کو آج کل در پیش ایسے مرحلے — جیسے ہیبت آفریں ہوں راستے ظلمات کے
ہے بظاہر روشنی، باطن کی تاریکی نہ پوچھ — گور سے تاریک تر گوشے ہیں محسوسات کے
آج انساں آزما ہے فطرتِ انسانیت — رخ پر اپنے ڈال کر پردے صفات و ذات کے
اتحاد و صلح سے بیزار ہیں اہل وطن — ہر طرف پرشور کچھ طوفان ہیں جذبات کے
ان کی فطرت کو جگا دے اے چراغانِ بہار
پھر چمک اٹھیں یہ پروانے اندھیری رات کے

نظم چراغانِ بہار میں سیماب کا اندازِ بیان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کے قلم کی روانی میں کسی خوف اور جھجک کا مسئلہ نہیں آتا۔ وہ اپنے جذبات و خیالات کا بے تکان اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے باخبر ہیں۔ سیاست، مذہب، معاشرت، قومیت،

مذہبی ارکان وعبادت کا زیرلب مضحکہ اڑانے سے بھی نہیں چوکتے اور انھیں محض رسمیات کا نام دے کر ظاہری عبادات سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ نظم ''میرا مذہب'' سے چند اشعار پیش ہیں:

یہ جو انگڑائی سی صبح وشام لے لیتا ہوں میں — عرش کو چھو کر خدا کا نام لے لیتا ہوں میں
ذکر کرتا ہوں، مگر خاموش، بے شور وخروش — سانس سے اپنی زباں کا کام لے لیتا ہوں میں
ذروں کی پاکیزگی پر اعتبار نور ہے — خاک سے بھی جامۂ احرام لے لیتا ہوں میں
مسجد اور مندر کی شورش سے ہوں دل برداشتہ — خلوت دل سے بھی ایسے کام لے لیتا ہوں میں
الغرض ہوں بے نیاز رسم و راہِ بندگی — جس طرح ہوتا ہے اس کا نام لے لیتا ہوں میں

اس سے دل غافل نہ ہو، مذہب کا مطلب ہے یہی
یاد کر لیتا ہوں اس کو میرا مذہب ہے یہی

نظم ''قربانی'' میں سیماب نے بظاہر مسلمانوں کو اپنے کردار درست کرنے، ظاہر داری و ریاکاری، حرص وحوس اور نفس پرستی سے بچنے اور خدا کے بندوں کے خاطر قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے لیکن الفاظ وتراکیب اور ان اشعار کا لہجہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پس پشت بھی ان کی مذہب بیزاری کام کر رہی ہے۔

اے مسلمان، اے رواج و رسم کے ڈھالے ہوئے
شہرت و کبر و ریا کی گود کے پالے ہوئے
اک مجسم نقش استعمار ہے ترا وجود
ہے فریضے میں بھی تجھ کو حسرتِ نام و نمود
رسم قربانی کے خوگر، قومیت کے غمگسار
خود بھی ہوجاتے تھے ناموسِ الٰہی پر نثار

انسانیت، وطنیت، آزادی وغیرہ موضوعات پر وہ خوب نظمیں لکھتے ہیں۔ ان کی ایک دوسری نظم شگفتِ نظر ہے۔ یہ نظم ان کے فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کی حامل ہے جس میں انھوں نے اپنے مفکرانہ خیالات کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

پھر جہانِ رنگ و بو نشوونما پانے لگا　　خلد کی آغوش میں صحرا نظر آنے لگا
پھر فروزاں روحِ تازہ خاک مردہ میں ہوئی　　پیکرِ افسردگی پھر نور برسانے لگا
پھر زمیں نے کر دیئے اپنے خزانے آشکار　　ذرہ ذرہ لعل و گوہر بن کر اترانے لگا
پھر بساط ارض نیرنگ نمو سے کھل اٹھی　　پھر جمالِ رنگ و نزہت جلوہ فرمانے لگا
پھر مزاج آفرینش نے نئی انگڑائی لی　　خونِ تازہ نبض نامیہ میں لہرانے لگا

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گیں جو پنہاں ہو گئیں

سیماب نے اپنے اعلیٰ وارفع خیالات کو فنکارانہ کمال کے ساتھ بڑی خوبی سے شعر کے پیکر میں ڈھالا اور ادبی وفنی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ یہ خصوصیت کن تحریران کی زبردست قدرت کی دین ہے۔ ان کے یہاں ہر جگہ متانت وسنجیدگی اور تہذیب وشائستگی نظر آتی ہے۔ ابتذال ورکاکت بالکل نہیں ہے۔ وہ معمولی باتوں سے دوررس نتائج مرتب کر کے ادب اور زندگی کے صحیح رشتے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سیماب جہاں اخلاقی نظموں میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں وہیں مذہبی نظموں میں بھی اپنے قلم کی جولانی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ سیماب کی نظموں کے پہلے مجموعے ''نے ستاں'' میں مذہبی اعتبار سے ان کو پختگی، جوش وخروش اور روحانی بلندی کے برعکس ''کارامروز'' اور ''ساز وآہنگ'' میں ان کی فکر ومزاج میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ کارامروز میں وہ کرشن کی لیلا گانے میں مستغرق ہیں تو ساز وآہنگ میں

اپنی قربانی کا اس دنیا میں کچھ سامان کر
خواہشوں کو نفس کو پیشِ خدا قربان کر

جاری و باقی ہے جب تک حرصِ نفسانی تیری
ہو نہیں سکتی کبھی مقبول قربانی تیری

سیماب اپنی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی نظموں کے ذریعہ اس سوئے ہوئے احساس رفعت اور قوت کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسی طرح وہ بڑی متانت کے ساتھ کبھی دوسری قوموں کا عروج دکھاتے ہیں تو کبھی اہلِ وطن کی پستیوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری ایک طرف تو قوم پرستی کی علمبردار ہے تو دوسری طرف ایک حیثیت سے اقبال کی شاعری کا تکملہ۔[۱]
سیماب نظموں کے بارے میں کلیم عجم میں لکھتے ہیں:

''میری نئی قومی اور اخلاقی نظموں میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جنہیں میں بہترین تعین کرتا ہوں مثلاً ایشیا، غدار قوم و وطن، تقویم اسلامی کے تین دور پیر شوالہ، مرا مذہب، قبروں کے غلط کتبے اور روحوں کے اعمال نامے، لقمۂ تلخ، مسجد اور مندر کے پرستاروں سے، طالب علم، بیداری، مشرق اور اذانِ ہمالہ۔''[۲]

سیماب کی مذہبی نظم ''پیر شوالہ'' سے اشعار ملاحظہ ہوں:

سن تو اے پیر شوالہ، اے مقدس برہمن! اے پرانے دیوتاؤں کے پرستار کہن!

۱۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص ۲۱۲
۲۔ کلیمِ عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۱۲۸

میں تقدس سے تیرے واقف ہوں تجھ سے باخبر　　رات دن تو میری نظروں میں ہے تجھ کو کیا خبر
ہاں مگر یہ تو بتا، پوجا کو جب آتا ہے تو　　آرتی کے وقت یہ کیا شام کو گاتا ہے تو
ہے پربھو آنند داتا گیان ہم کو دیجئے　　"ان ہمارے دشمنوں کو دور ہم سے کیجئے"
میں تیرا دشمن کہاں ہوں، میں تو تیرا دوست ہوں　　ہم نفس، ہم جسم، ہم اعضا ہوں اور ہم پوست ہوں
سلسلہ کردیا آزر اور خلیل اللہ　　کفر اور اسلام میں ہے ایک بطنی واسطہ

زادۂ کفر ایں ہمہ آوازۂ راز ست و بس
بت شکن پروردۂ آغوشِ بت ساز ست و بس

مذہبی اور اخلاقی نظموں میں سیماب کی نظم ''عید اور بسنت'' میں بھی مذہبی رسومات اور تیوہاروں پر سیماب کا طنزیہ لہجہ اپنی جولانیاں دکھاتا ہے اور ان تیوہاروں میں محبت و عقیدت سے شریک ہونے کے بجائے سیماب ان کا خاکہ اڑاتے نظر آتے ہیں۔

دیکھ کر درد آشنائے گلشن و صحرا مجھے　　رنگ و بو کی دعوتیں دینے لگی دنیا مجھے
چاک دامان سحر پر مثبت کر کے لفظ عید　　عیشِ ماضی کا دیا کرتا ہے دل دھوکہ مجھے
لہلہا اٹھتی ہے خاکِ دشت سے اک زندگی　　دیکھ کر خوں گشتۂ یادِ گل و لالہ مجھے
ہر طرف سے گھیر لیتا ہے مسرت کا سراب　　وقت دیتا ہے فریبِ عشرت بے جا مجھے
میری پیدا کردہ رسمیں ہیں یہ عید اور یہ بسنت　　کس طرح مسحور کر لے ان کا نظارہ مجھے
جانتا ہوں میں حقیقت ہر نشاط و عیش کی　　جلوۂ امروز ہے آئینہ فردا مجھے

سرخ ہے چہرہ شفق کے عکس سے دل سرد ہے
دوسرا رخ میری تصویر خوشی کا زرد ہے

سیماب کا یہ خاص وصف رہا ہے کہ جہاں طنز آمیز لہجے میں ہی سہی وہ اپنی اخلاقی اور

مذہبی نظموں کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کی نگاہ معاشرتی نظموں کے ذریعہ قوم کی بے عملی، تہذیبی انحطاط، تنگ نظری، استحصال اور دیگر کمزوریوں کی نشاندہی کر کے ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اکثر جگہ ان کے طنزیہ لہجہ میں تحقیر آخری بھی شامل ہو جاتی ہے جو ان کی شدت پسندی کی دلیل ہے۔ اپنی نظموں میں روزہ دار مزدور، مغربی مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام، مزدور کوہسار، مزدور اور کسان سے وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔

سیماب اکبرآبادی کو مزدوروں کی زندگی، ہندوستان کے تمدنی زندگی کا عمدہ نمونہ محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں مزدوروں میں خلق و مروت بھی نظر آتی ہے اور سچائی و دیانت داری بھی۔ اسی لئے مزدور کی ہستی انھیں انسانیت کے سبب سے بلند مقام پر فائز نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم روزہ دار مزدور'' کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

صبح کا نکلا ہوا اب شام کو لوٹا ہے گھر — کان آوازِ اذاں پر ہیں، نظر ہے جیب پر
بوجھ دن بھر اپنے نازک دوش پر ڈھوئے ہوئے — غیر آسودہ ارادے، حوصلے سوئے ہوئے
اجر مجبوری کا دل میں جائزہ لیتا ہوا — فطرت سرمایہ داری کو دعا دیتا ہوا
اپنے روزہ دار بچوں اور بیوی کا خیال — اتنی محبت پر بھی اپنی فاقہ مستی کا خیال
پیاس سے لب خشک ہیں پھر اس پہ محنت کا عذاب — سوچتا ہے کر نہیں سکتا مگر پورا حساب

سیماب اکبرآبادی نے محنت کش طبقے کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے مزدوروں کی بے چارگی، آہوں اور کراہوں کا صداقت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ مزدوروں کی اقتصادی بدحالی کا احساس دلانے کے لئے انھوں نے ان کی خانگی زندگی کے مرقعے پیش کئے ہیں۔ یہ مرقعے مختلف واقعات اور تقریبات سے اخذ کر کے صورت پذیر ہوئے ہیں۔

ان کی کسی نظم میں مزدور کے اہل وعیال کی فاقہ کشی، کسی میں اس کے گھر میں عید کا

منظر دل میں سوز نظارہ، کسی میں دیوالی کا منظر پیش کیا گیا ہے، جو شاعر کے مشاہدے کی صداقت پر مبنی ہے۔ اسی طرح ایک نظم ''مزدور اور کسان'' بھی ایک اہم نظم ہے۔ اس سے اشعار ملاحظہ ہوں:

اے بیکسو، مفلسو، غریبو — اے میرے وطن کے بدنصیبو
پوجو میرے آہنی قلم کو — دو آج دعائیں میرے دم کو
میں نے دلِ ذرہ کو تپش دی — کانٹوں کو عطا نئی خلش کی
مسرور ہو اے غریب مزدور — دنیا کا بدل رہا ہے دستور
دل شاد ہو اے کسان، دل شاد — ہونے کو ہے تیرا دیس آزاد
آنے کو ہے فصلِ شاد کامی — ہے عالمِ نزع میں غلامی
افرادِ وطن کا ساتھ دے کر — ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر
پرواز کرو اب آشیاں سے
منزل نزدیک ہے یہاں سے!

محنت کش طبقہ، خاص طور سے مزدور اور کسان، سے ترقی پسندی کے دور میں شعراء و ادباء نے بہت ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور طرح طرح سے ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے تھے۔ مذکورہ بالا گفتگو اور مثالوں سے سیماب کی اس موضوع سے دلچسپی عیاں ہو چکی ہے۔ لیکن جس طرح مزدوروں کے دیگر طبقوں سے تعلق اپنی فکری و فنی جولانیوں کا مظاہرہ کیا ہے، اسی طرح پہاڑوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی مشقت اور سخت کوشی کو بھی بہت واضح انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ نظم مزدور کوہسار میں انھوں نے پہاڑوں کے مزدوروں کی حالت زار کا نقشہ حقیقت نگاری اور تاثیر کے ساتھ کھینچا ہے۔

اس کی رفعت نے مگر مجھ کو بڑا دھوکا دیا ایک ہی منظر نے قلب و روح کو سما دیا
میں جہاں ٹھہرا تھا، تھی اس سے بھی نیچی ایک سڑک راہچہ جاتا تھا ایک زینے سے اوپر مال تک
میں نے اک مزدور کو دیکھا وہاں چڑھتے ہوئے سیڑھیوں پر مثلِ مور ناتواں چڑھتے ہوئے
پیٹھ پر بارِ گراں، آنکھوں میں نم، دل میں خضوع جس طرح کوئی نمازی روئے ہنگام رکوع
آنسوؤں میں تھے پسینے کے بھی قطرے بے قرار رو رہی تھیں اس کی آنکھیں، تھی جبیں بھی اشکبار
خاک پر احساں تھا اس کے دیدۂ خونبار کا وہ بھی گویا چلتا پھرتا ابر تھا کہسار کا
اپنی لکڑی ٹیکتا، آہستہ بل کھاتا ہوا چل رہا تھا سختیٔ منزل سے کتراتا ہوا

کوئی اس کے اضطرابِ حال کا پرساں نہ تھا
جیسے سب انسان تھے، مزدور ہی انساں نہ تھا

سیماب نے اپنی نظموں میں اپنے زمانے کے رجحانات اور ان کے تقاضوں کو پوری طرح سمو دیا ہے۔ وہ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی نظموں میں مزدوروں کے آنسو ہیں، ان کی مظلومیت ہے اور ان کے جذبات و احساسات کی انھوں نے پوری طرح مرقع کشی کی ہے اور بالآخر وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مظلوم و نادار طبقے میں بیداری پیدا ہو۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''سیماب نے دردمند ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول سے اثرات قبول کرتے ہوئے سرمایہ دار کے خلاف احتجاج کیا ہے۔'' [۱]

بہرکیف سیماب سرمایہ داروں کو مزدوروں کے مقدس آنسوؤں کی عزت، ان کے کمزور دلوں کی دل جوئی اور انھیں حقِ خدمت ادا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۸۴

ڈاکٹر سیدہ جعفر بھی لکھتی ہیں:

''سیماب اپنے عہد کے بدلے ہوئے حالات میں مزدوروں
کے لئے ایک سماجی قوت بن کر ابھرے۔''[۱]

سیماب کی مذہبی، اخلاقی، اصلاحی نظموں میں ''قبروں کے غلط کتبے'' اور ''روحوں کے اعمال نامے'' اپنے اندر ایک جدت اور ندرت لئے ہوئے ہیں۔ ایک صوفی کا اعمال نامہ، ایک مولوی کا اعمال نامہ، ایک بادشاہ کا اعمال نامہ، ایک تاجر کا اعمال نامہ، ایک لیڈر کا اعمال نامہ، ایک طوائف کا اعمال نامہ وغیرہ دلچسپ اور انوکھی نظمیں ہیں، جس میں انھوں نے فطرتِ انسانی کی کمزوری کو ظاہر کیا ہے۔ مثلاً نظم ''ایک مولوی کا اعمال نامہ'' سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے بحیرت پڑھنے والے کتبۂ لوحِ مزار — کر نہ ان کالک بھرے لفظوں پہ ہرگز اعتبار
ہے سیاہی ان کی میری رو سیاہی پر گواہ — نامۂ اعمال ان سے بھی زیادہ ہے سیاہ
عالم قرآں تھا میں اور ماہر علم حدیث — باوجود اس کے مرا باطن تھا خاطی و خبیث
عام لوگوں کو تھا جن باتوں سے لازم احتراز — سب روا تھیں وہ مجھے در پردۂ ریش و راز
مل رہی ہے اب مجھے دنیا فریبی کی سزا — ہے فشار قبر کا دن رات مجھ کو سامنا
اب تک اس کتبے سے آلودہ گنہگاری میں ہوں — مبتلا مر کر بھی پاداشِ ریاکاری میں ہوں

دور لے جا کر مرے کتبے کا پتھر پھینک سے
اور میری لوحِ تربت کو کچل کر پھینک دے

جیسا کہ احادیث میں ہے، اعمال کا سلسلہ مدت پر ختم ہو جاتا ہے۔ نیک و بد اعمال،

۱۔ تاریخ ادب اردو، سیدہ جعفر، ص ۱۴۰۱

اخلاص و ریا کاری اور دوسرے تمام اعمال کی حقیقت مدت کے بعد ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ اعمال ناموں سے متعلق ان نظموں میں سیماب نے بھرپور طنز سے کام لیتے ہوئے سماج کے مختلف طبقات اور کرداروں کے اعمال اور سزا و جزا کا احتساب کیا ہے اور بالواسطہ طور پر ظاہرداروں، رہنماؤں، مولویوں اور تاجروں کو نیک عمل کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔

باب سوم۔ حدیثِ ادب

سیماب اکبرآبادی نے ''ساز و آہنگ'' کے باب سوم میں ''حدیثِ ادب'' کے عنوان کے تحت شعر و حکم پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کی قادرالکلامی اور شاعرانہ عظمت کی مظہر ہیں۔ ان میں موضوعات کی گوناگوں اور بیان کی دلکشی و نیرنگی ہر جگہ اپنے جلوے دکھا رہی ہے۔ افکار و خیالات کے تموج کی لہریں ہر نظم میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں فرشتۂ محبت، تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں، نیلا ناگ، کمسن راہبہ سے، جنت ارضی، موجِ تصور وغیرہ اسی کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں تخیل کی رفعت، نفسیات پر گہری نظر اور معاشرے کے حالات سے بھرپور واقفیت کے نتیجے میں سیماب شاعری کے بہت بلند معیار پر پہنچ گئے ہیں۔ شوکت لفظی، ٹھہراؤ اور عمیق مشاہدہ اس حصہ کی اہم خصوصات ہیں۔

سیماب نے ان نظموں میں اپنے اعلیٰ و ارفع خیالات کو فنکارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتنا ہی فلسفیانہ و پیچیدہ خیال ہو اس کو شعری پیکر عطا کرتے وقت انھوں نے ادبی اور فنی تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''صبح بہار'' سے ایک بند ملاحظہ ہو:

رحمت ہے دہر کے لئے فطرت کا انقلاب　　گو اس سے فیضیاب نہیں ماہ و آفتاب

دنیائے کہکشاں میں تغیر نہیں کوئی　　نیرنگیوں سے عالم ارضی ہے کامیاب
یہ صبح و شام اور یہ دھوپ اور چاندنی　　یہ گرم و سرد یہ کبھی آندھی کبھی سحاب
انسان کا مزاج تنوع پسند تھا　　فطرت نے دے دیا اسے آرام و اضطراب
اکتا گئیں جو اس کی نگاہیں بہار سے　　موجِ خزاں نے کردیئے پیدا نئے سراب
فضلِ خزاں سے جب ہوا افسردہ اس کا دل　　صبح چمن نے نذر کیا تختۂ گلاب
جب کمسنی کے کھیل سے حال تنگ آ گیا　　انگڑائی لے کے آ گئی سرمستی شباب

سیماب نے ہمیشہ وقت کے تقاضوں اور عصری رجحانات کو سمجھنے اور شاعری کے ذریعہ انھیں عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کسی بھی قسم کی لسانی، شعری اور ادبی گمرہی کو جائز قرار نہیں دیا۔ معمولی باتوں سے دوررس نتائج مرتب کر کے وہ ادب کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''کمسن راہبہ'' بظاہر رومانیت انگیزی سے شروع ہوتی ہے لیکن تقدس کے جذبات پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔

حسن رنگ و بو کی ایک دعوت ہے عالم کے لئے　　ایک پیام معصیت ہے ابن آدمؑ کے لئے
محفلِ عیش و طرب کا جزو غالب حسن ہے　　شاہد رنگیں ہے لازم بادۂ جم کے لئے
عصمتِ رنگِ شفق ہر شب کو ہوتی ہے تباہ　　باعثِ تخریب ہے ہر صبح شبنم کے لئے
ترکِ دنیا کا سبق دیتی ہے اہل ناز کو　　انتظام کسل ہے کیف مجسم کے لئے
ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی ہے مادیت کو دواع　　ترے سینے میں تڑپ ہے روحِ اعظم کے لئے
دیکھ وہ بجھنے لگے ایوان ہستی کے چراغ　　وہ فرشتے آئے تیرے خیر مقدم کے لئے

سیماب کے نظریات بلند اور اعلیٰ ادبی اقدار و معیار کے حامل ہیں۔ ان کی نظموں میں پیش کردہ افکار کتنے ہی بلند و پیچیدہ ہوں، قاری کے ذہن کو نہ صرف بوجھل نہیں کرتے

بلکہ اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتے ہوئے غور وفکر کی طرف راغب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''تکلف احساس'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو ہیں ناز ونعم پروردہ وہ دکھ میں زیادہ ہیں — ہمیں مشکل میں رکھتی ہیں یہ تن آسانیا اپنی
نہیں احساس تک سورج کو اپنی شعلہ کاری کا — شکایت بحر سے کرتی نہیں موجِ رواں اپنی
فسردہ پھول ہوجاتی ہیں خاموشی سے شاخوں پر — پگھل جاتی ہیں شمعیں داب کرمنہ میں زباں اپنی
زمین افتاد وپستی پر کبھی غمگین نہیں ہوتی — گوارا روز کرلیتا ہے گردش آسماں اپنی
سمجھتے ہیں بگولے رقص اپنی دشت گردی کو — کبھی کانٹے نہیں محسوس کرتے خشکیاں اپنی
جنھیں معلوم ہے رنگ مزاجِ ہستیٔ فانی — وہ غم ہی کو سمجھتے ہیں حیاتِ جاوداں اپنی
تیرا احساس ہی سب سے بڑی تکلیف خاطر ہے — کر احساسِ مصیبت سے نہ ہمت رائیگاں اپنی

ذیل میں سیماب کی ایک اور نظم ''اختلاف ظرف'' کو پیش کیا جارہا ہے جس میں تقابل کے ذریعہ زندگی کی منفی اور مثبت قدروں کو واضح کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

بلند کوش ہوں ماحول سے الگ ہوکر
ستارہ ہے مری بزمِ خیال کی قندیل
میں سجدہ گسترِ فطرت، تو سنگ وخشت پرست
تو بندۂ درآذر میں ہم مذاقِ خلیلؑ
براہِ راست مرا کاروبار عرش سے ہے
تو خاکداں کی انھیں پستیوں میں خوار وذلیل
ہے طفلِ مدرسہ و خانقاہ تو اب تک
میں علم باطن و عرفاں کا فارغ التحصیل

تجھے ہے دعوتِ منزل ابھی جرس کی نوا

مجھے ہے نغمۂ منزل صدائے کوسِ رحیل

فرازِ طور سے بھی دور تر ہے بام مرا

بلند تیرے تصور سے ہے مقام مرا

یہ نظم سیماب کے افکار و خیالات اور ان کے تخلیقی مزاج کی اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے ٹھوس حقائق اور زمانے کے تقاضوں کو جذبے کی شدت کے ساتھ شعر کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں فنی چابکدستی، گہرائی، تخیل کی بلندی اور ندرت ادا بہت نمایاں ہیں۔ موجِ تصور، نیلا ناگ، خدا کہاں ہے، جنت ارضی، صدا الصحرا، نوائے مستقبل وغیرہ اسی سلسلے میں ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ''خدا کہاں'' کے عنوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا طویل قباؤں کی جنبشوں میں نہیں ہے

خدا سفید جٹاؤں کی بندشوں میں نہیں ہے

خدا تعیش فانی کی خواہشوں میں نہیں ہے

خدا وقار و عجب کی نمائشوں میں نہیں ہے

خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب ادھر آ

خدا کہاں ہے تجھے اس کا دوں جواب ادھر آ

وہ نامرادوں کے مجروح آسروں میں ملے گا

گناہگاروں کی خالص ندامتوں میں ملے گا

وفا پرست کے خوں ریز دامنوں میں ملے گا

غبارِ راہ سے ملفوف گیسوؤں میں ملے گا

وہ خون و خاک میں جلوہ نما ضرور ملے گا

خدا کے ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملے گا

ان کی ایک نظم ''تصور'' اگرچہ مختلف اجزاء میں بٹی ہوئی ہے مگر شاعر نے اپنے تخیل، انداز بیان اور زبان پر غیر معمولی قدرت سے ان اجزاء کو باہم مربوط کر دیا ہے جس سے پوری نظم میں ربط و تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری زندگی میں تصورات کی اہمیت اور قدر و قیمت پر یہ بہت اہم اور ذرا طویل نظم ہے جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

نکالا خلد سے انسان کو جب سادہ گناہی نے

کیا پیدا نیا ماحول انجام تباہی نے

بہار افسردگی سے، غم سے عیش سیم گوں بدلا

قرار آزردگی سے بیقراری سے سکوں بدلا

غضب کی دھوپ سے اکرام و رحمت کی گھٹا بدلی

شگفتہ پھول تو نے میرے کانٹوں سے بدل ڈالے

اجالے میری قسمت کے اندھیروں سے بدل ڈالے

ٹپکتا تھا کبھی ہونٹوں سے کوثر میرے سینے پر

مگر مجبور ہوں اب ساغر زہر اب پینے پر

یہ پورا بند شاعر کی بے بسی، بے کسی اور مجبوری کے اظہار میں گزرا ہے اور اس کے آخر میں شاعر یہ تمنا کرتا ہے۔

مگر تسکین خاطر کا کوئی سامان تو دے دے

نہ دے کچھ اور بابا دل کا اطمینان تو دے دے

لیکن نظم کے دوسرے بند میں ہاتف غیبی نے تسلی و دلاسا دیتے ہوئے انسان کو تصور کی طاقت سے آشنا کرایا ہے۔

نئی طاقت بمقدارِ تدبر تجھ کو دیتے ہیں

ہم اک قوت بہ عنوانِ تصور تجھ کو دیتے ہیں

تصور ہے کرشمہ اور کرشمہ ساز ہم خود ہیں

تصور کے لئے بال و پر پرواز ہم خود ہیں

اگر ہو روح تیری مضطرب خاکی نقابوں میں

تو سیر خلد آساں ہے تصور کے حجابوں میں

جناں کیسی! تصور شہپر ارباب باطن ہے اسی پردے میں بزم عرش تک پرواز ممکن ہے

اس کے بعد شاعر نے انسانی تصور کی خودمختاری اور جولان گاہ کی تفصیلات اور اس کی لامتناہی نیرنگیوں کا دلچسپ و دلکش بیان کر کے آخر میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ساری دنیا تصورات کے ذریعہ ہی چل رہی ہے۔ ہر کام، ہر عمل اور مہم میں رکاوٹ آسکتی ہے لیکن تصور کی خدائی ایسی ہے کہ اسے روبہ عمل لانے میں منٹوں ہی نہیں سکنڈوں کی دیر نہیں لگتی۔ اسی لئے آخر میں شاعر نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

اس کی وسعت کونین میں خرما نروائی ہے

خدا کے بعد دنیا میں تصور خدائی ہے

سیماب علم شعر اور فن عروض کی باریکیوں کے رمز شناس اور ماہر تھے۔ الفاظ پر

زبردست قدرت حاصل تھی اور بیان کی وسعتوں اور نیرنگیوں پر انھیں عبور تھا۔ وہ جس موضوع کو جس طرح چاہتے، شعری قالب میں پیش کر دیتے۔ اکثر ترنم و موسیقی اور منظر نگاری میں بھی وہ بے بدل نظر آتے ہیں۔ انھیں خود بھی اپنی اس شاعرانہ عظمت و کمال کا علم بھی ہے اور اس پر یک گونہ ناز بھی۔ چنانچہ اپنی تعلّی پر مبنی ایک نظم ''مقامات سیماب'' اس کا واضح ثبوت ہیں۔ اس کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہو جس میں مصرعہ اول کے آخر میں اپنی صفات بیان کی ہیں:

ہر وقت فضا گیر، چمن ساز، نواخیز
اب کیا وہ حریم گل و ریحان میں ملے گا
سیماب کو ڈھونڈے گے جواب ڈھونڈنے والے
وہ قبل سحر گشتِ گلستاں میں ملے گا
پھر شام کو وہ بندۂ حق مردِ مسلماں
موجود کسی کعبۂ ایماں میں ملے گا
پھر شب کو ملے گا وہ ہم آغوش صد افکار
یاطق سرا بزم سخنداں میں ملے گا
اور اس کو ستایا نہ کسی نے تو وہ شاید
آسودۂ خواب اپنے شبستاں میں ملے گا

ان کی نظم ''تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں'' سے چند اشعار پیش ہیں:

مرحبا اے وارث اورنگِ مغرب، مرحبا — تو نے روحِ ماضیٔ مشرق کو زندہ کر دیا
صرف دلجوئی ادائے کجکلاہی تو نے کی — تو نے کی، ہاں فی الحقیقت بادشاہی تو نے کی
تاج شاہی ہے اک انگڑائی ترے ایثار کی — قیصری ٹھوکر ہے تیرے جذبۂ خوددار کی

جوگ الفت کا لیا تو نے بقید سروری　　مل گئی فیضِ محبت سے تجھے پیغمبری
تو نے ثابت کر دیا دنیا کی عظمت کچھ نہیں　　دل کی دولت دل کی دولت ہے حکومت کچھ نہیں

بہر حال یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سیماب کی نظم نگاری، توازن اور تنوع کی دلکش مثال ہے۔ان کی ان نظموں میں حقیقتاً وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کو جانِ شاعری کہا جا سکتا ہے۔

باب چہارم۔سرودِ روح

ساز و آہنگ کے باب چہارم ''سرودِ روح'' میں معتقدات سے متعلق نظمیں ہیں جن میں مذہبی شخصیات کا تذکرہ، فلسفہ اور انسانیت وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔فطرتِ الٰہی کا عرفانی دور اور اس کے مخصوص پیامی، عنوان کے تحت نظموں میں ابنِ آذر، ابنِ عمران اور ابنِ مریم وغیرہ شامل ہیں۔جن میں سیماب نے مذکورہ شخصیات کے کردار کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔نظم فطرتِ الٰہی میں ابنِ آذر یعنی حضرت ابراھیمؑ کا تذکرہ کیا ہے۔اس عہد میں انسان مذہب اور فطرت سے نا آشنا تھا۔بدعات شرک ناروا، شخصیت پرستی، بت پرستی کی انتہا عروج کو پہنچ چکی تھی۔لوگ خود تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھ رہے تھے اور آذر بت تراشی کا سب سے بڑا نمونہ تھا۔ایسے دور میں آذر کے گھر میں ابراھیمؑ کی آمد ہوئی جس کی تفصیلات تاریخوں میں موجود ہے۔بالآخر ایک وقت آیا کہ انھیں حضرت ابراھیمؑ کے ذریعہ خدا کا گھر بنا اور عرفانِ ذاتِ حق تعالیٰ کا دور شروع ہوا۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ تھا انسان جب دنیا میں فطرت آشنا کوئی　　نہ تھا جب تا حد احساس بندوں کا خدا کوئی
عقائد آزما تھا دور شخصیت پرستی کا　　نہ تھی بدعات و شرکِ ناروا کی انتہا کوئی
خدائی کر رہے تھے چند پتھر خود تراشیدہ　　نہ تھا ان سنگ پاروں میں حقیقت کا پتا کوئی

ہوا بت ساز کے گھر میں بالآخر بت شکن پیدا　　خلیل اب تک نہ دنیا میں ہوا تھا دوسرا کوئی
کیا اک ربط قائم عبد اور معبود میں اس نے　　نہ رکھا نام کوئی قائم نشانِ ماسوا کوئی
بنایا گھر خدا کا، توڑ کر بت، نافِ عالم میں　　ہوئی صدیوں سے اس ڈھب کی نہ پھر اب تک بنا کوئی
ہوا اس دور میں انساں کو عرفانِ ذات باری کا　　کہ تھا آئینہ تنزیہ میں جلوہ نما کوئی

ہوئی ایوانِ کعبہ سے نوائے بت شکن پیدا
نیا مذہب ہوا آخر تہہ چرخِ کہن پیدا

یہ نظم فطرتِ الٰہی کا عرفانی دور میں، جس کے آغاز میں انسان کے فطرت سے نا آشنائی کا بیان کرتے ہوئے خود تراشیدہ پتھروں کو سجدہ کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر آگے چل کر حضرت ابراھیم خلیل اللہ کا ذکر کر کے عبد اور معبود میں رابطے اور مرکزِ عالم مسلمہ میں بت توڑ کر خدا کا گھر بنانے کا بیان کیا گیا ہے۔ اور ایسے دور میں انسان کو عرفانِ ذات باری کا آئینہ دکھایا ہے۔ اس طویل سلسلے کی نظم میں حضرت ابراھیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ کیا ہے جنھیں ابنِ عمران کے نام سے یاد کیا ہے۔ نظم کے چند اشعار درجہ ذیل ہیں:

کیا مجبور اک الکن زبان کو رب ارنی پر　　لگا دی آگ دل میں ڈھونڈنے کو جب چلا پانی
صدائے "لن ترانی" بر بنائے پردہ داری تھی　　مگر منظور تھی خود ان کو اپنی جلوہ افشانی
فرار طور پر بجلی چمک کر ہوگئی پنہاں　　کلیم اللہ کے دل پر ہوا الہام ربانی
کسی انسان نے تفویض کی ہوتی تو بول اٹھتا　　عصا کی سامریت اور ید بیضا کی تابانی
ہوا ثابت وہ اپنی قوتوں کے ساتھ قائم ہے　　وہی ہے حیّ قیوم اور وہی شایان یزدانی
کیا فرعون کو غرق آب رودِ نیل میں کس نے؟　　فرد کی کس نے اسرائیلیوں کی دل کی طغیانی؟
وہ خود انسان کے پردے میں اب تنظیم فرما تھا　　جو "خوداں" تھے انھیں کو تو مقدر تھی "خدادانی"

خلیل اللہ کو عرفاں ملا تھا، بہترین اس کا
کلیم اللہ سے مقصود تھا عین الیقین اس کا

نظم ابنِ عمران میں سیماب نے حضرت موسیٰؑ کے معجزات، یدِ بیضا، صدائے ربّ ارنی، ولن ترانی، فرعون سے کشمکش، عصائے سامری اور پھر دریائے نیل میں فرعون کے غرقاب ہونے کے واقع کو نظم کیا ہے جو بہت دلکش و مؤثر اور مذہبی و تاریخی حوالوں سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ نظم ابنِ مریم میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسائیوں نے نیا فتنہ پیدا کر کے تثلیث کو اختیار کیا اور حضرت عیسیٰؑ کی پرستش کرنے لگے اور پھر سے شرک و بدعات کا دور شروع ہو گیا۔ لیکن پھر غیرت الٰہی نے جوش مارا اور دنیا کو شرک و بدعات سے پاک کرنے کے لئے حضرت محمد ﷺ ابن عبداللہ کو جہان میں بھیج دیا تا کہ دنیائے انسانیت اسم و محبت کی روشنی سے منور ہو جائے اور پھر تو دنیا کا سب سے بڑا انقلاب برپا ہو گیا جس کی ضیافشائی اور روحانیت قیامت تک باقی رہے گی۔

سلام اس پر صلوٰۃ اس پر درود کائنات اس پر خدا کی ترجمانی جس نے کی انسان کے پیکر میں

نظام شرک پیغام رسول اللہ نے الٹا

نقاب ''اللہ'' کا فرزند عبداللہ نے الٹا

سیماب نے مذہبی، اسلامی اور تاریخی نظموں کے علاوہ ہندوستان کی تاریخی شخصیات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، جن میں سری کرشن، گرونانک، گوتم بدھ وغیرہ نظموں میں تاریخی صداقت کو شعریت کے لباس میں پیش کیا ہے۔

سیماب نے نظم نوازش دوست میں کرشن سداما کے عہد کو یاد کیا ہے۔ وہ بانسری کہاں ہے، میرا خطاب سری کرشن کی قوم سے وغیرہ نظموں میں ان کا آفاقی پیغام موجود ہے۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں صداقت، محبت، نغمہ عرفانیت سے فضا معمور و لبریز نظر آتی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ان کی تاریخی نظموں میں شعور کی بالیدگی اور گہرائی ملتی ہے۔ انھوں

نے اپنی نظموں میں تاریخ کی ایسی ہستیوں کو پیش کیا ہے جنھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں اپنا اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے توسط سے معاشرہ کے لئے جو کچھ پیش کی ہے وہ ادب کے علاوہ سماجی اعتبار سے بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

باب پنجم۔ نغمہ معصوم

قومی زندگی کے عروج وکمال اور تعمیر میں تو بچوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچے ہی قوم کے ستون ومعمار ہوتے ہیں اور انھیں کے ذریعہ قوم کا مستقبل استوار ہوتا ہے۔ اردو میں بچوں کے فہم وادراک کا مطابق ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں جو ان کے ذہنی ارتقاء اور اخلاق و عادات کو سنوارنے میں معاون و مددگار ہیں۔ آج سے تقریباً دوسو سال پہلے نظیر اکبرآبادی نے بچوں کے لئے نظمیں لکھی تھیں جن میں کھیل کا بیان، سیر تماشے کا ذکر اور مناظر قدرت کا بیان خصوصیت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ نظیر کے یہاں اس نوعیت کی نظمیں ریچھ کا بچہ، ہنس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظیر کے بعد آزاد اور حالؔی بھی اس سے متاثر ہوئے اور بچوں کے لئے متعدد نظمیں لکھیں۔ حالؔی اور آزاد کی نظموں میں بڑی عمدگی اور کشش پائی جاتی ہے۔

اسماعیل میرٹھی کا شمار بچوں کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے اور ان کی نظمیں درسی کتب میں ہمیشہ اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ اسماعیل کو بچوں کی نفسیات، عادات اور جذبات کا گہرا شعور ہے۔ اس لئے انھوں نے ان کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں برسات، خدا کی کاریگری، پن چکی، ایک جگنو اور بچہ، گائے، ایماندار لڑکا، جاڑا اور گرمی وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اقبال، تلوک چند محروم وغیرہ نے بھی بچوں کے لئے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں ان کی دلچسپی کے موضوعات کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقاء کا خاص

طور سے خیال رکھا گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے حب وطن اور مناظر فطرت سے متعلق بھی متعدد نظمیں لکھی۔ بچوں کے لئے لکھنے والوں میں مذکورہ شعراء کے علاوہ سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر وغیرا ہم شعراء ہیں۔

بچوں کے لئے نظمیں لکھتے ہوئے سیماب نے ان کے تصور، تخیل اور نفسیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی نظمیں ترنم، موسیقی اور غنائی کیفیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موسیقی کا اثر بچوں کے اذہان پر زیادہ پڑتا ہے، جس کی وجہ سے بچے اسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے روزمرہ زندگی کے واقعات، فطری مناظر، گھریلو اشیاء اور پالتو جانوروں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ اس حصہ میں سیماب کی نظموں میں دعا، خدا، بچوں کی دعا، خدا کا شکر ادا کرو، جگنو اور بچہ، بلبل اور گلاب، برسات، سلیمہ کی بلی، وطن کی لگن، میں ملک میں لکھ پڑھ کر بہت نام روشن کروں گا، ماں کی لوری، شام کی دعا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ نظمیں سیماب نے اس طرح لکھی ہیں کہ فطرت کا حسن ان میں ابھر آیا ہے۔ ان نظموں کی کامیابی کا راز اس بات پر مضمر ہے کہ یہ بچوں کی سمجھ اور ذہنی معیار کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بچوں میں بہت مقبول بھی ہوئیں۔ برسات ایک خوبصورت نظم ہے جس میں اختصار کے ساتھ ترنم بحر اور آسان لفظوں میں برسات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

برکھا آئی، بادل آئے　　اوڑھے کالے کمبل آئے
ٹھنڈی ٹھنڈی آئیں ہوائیں　　کالی کالی چھائیں گھٹائیں
گرمی نے ڈیرا اٹھوایا　　دھوپ پہ سایہ غالب آیا
پھیلا دن کے ساتھ دھندلکا　　بھورا، بھورا، ہلکا، ہلکا
بدلی آئی شور مچاتی　　بھیگے بھیگے نغمے گاتی
بادل سے امرت جل برسا　　امرت جل کیا کومل برسا

ہو گئی زندہ مرہ کھیتی　　دھل گئے ذرے، چمکی ریتی

یہ رت یہ برسات کا موسم

ہے گویا جذبات کا موسم

بچوں کی نظموں میں ''سلیمہ کی بلی'' بھی ان کی ایک اور دلچسپ نظم ہے۔اس نظم میں بلی اور بطور خاص پالتو بلی کی عادتوں کی ایک متحرک تصویر ابھرتی ہے۔خاص کر اس کی چھینا جھپٹی،اس کے ناز نخرے کی عادت،شرافت اور مانوسیت بہت خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔

بڑی شوخ ہے اور بہت منچلی ہے　　بڑے ناز نخروں سے گھر میں پلی ہے

ہے چھوٹا سا قد، رنگ میں صندلی ہے　　یہ سانچے میں قدرت کے گویا ڈھلی ہے

سلیمہ کی بلی بہت ہی بھلی ہے

نہ یہ کاٹتی ہے، نہ یہ نوچتی ہے　　بہت ہی غریب اور سیدھی بڑی ہے

سلیمہ سے اس درجہ ہل مل گئی ہے　　کہ اب اس کی گودی میں بیٹھی ہوئی ہے

سلیمہ کی بلی بہت ہی بھلی ہے

نظم ''جگنو اور بچہ'' میں انھوں نے بچوں کے جذبات اور ان کی ہمدردی کی تصویر کشی کی ہے۔اس نظم میں ان کا پیرایہ بیان مکالماتی ہے۔اس نوع کی ان کی دوسری نظم بلبل اور گلاب ہے۔ان نظموں میں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے درس و موعظمت دی گئی ہے۔نظم کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات بھی بچہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

دراصل سیماب اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ بچوں کی نظمیں ان کے اخلاق اور عادات کو سنوارنے اور ان میں شعور کی پختگی پیدا کرنے کی طرف رغبت دلانے والی ہونی چاہئے۔ان کی نظم جگنو اور بچہ ملاحظہ ہو:

جگنو: ادھر آؤ اے میرے نادان بچے　　کروں گا میں دو چار باتیں تمہیں سے
ہو مصروف کیوں کھیلنے میں تم ایسے　　سنو تو سہی کچھ پڑھو گھر پہ جا کے
نہیں پیارے بچے یہ دن کھیلنے کے

بچہ: میں ابا کا جانی میں اماں کا پیارا　　نہیں رنج میرا کسی کو گوارا
نہ جاؤں گا پڑھنے، یہ ہے کیا اشارہ　　میں کھیلوں گا ترا نہیں کچھ اجارا
چمکدار کیڑے مجھے کھیلنے دے!

جگنو: نہیں پیارے بچے نہیں کھیل اچھا　　کہ پڑھنے کا ہے اک یہی تو زمانہ
اگر ابتدا سے رہا شوق اس کا　　تو آجائے گا پھر بہت جلد پڑھنا
نہیں پیارے بچے یہ دن کھیلنے کا!

بچہ: پکڑ لوں گا تجھ کو جواب تو نے چھیڑا　　تو آیا بڑا علم والا کہیں کا
میں کھیلوں گا، کھیلوں گا ہر جا　　مجھے کھیل سے روکتا ہے پرندا
چمکدار کیڑے مجھے کھیلنے دے!

اس نظم کی دلکشی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کا انداز مکالماتی اور کہانی پن لئے ہوئے ہے۔ بچوں کو کہانیاں سننے کا فطری شوق ہوتا ہے اور ایسی نظمیں بچوں کے تجسس اور مسرت کے جذبے کو جگاتی ہیں، ان میں پختگی پیدا کرتی ہیں اور زندگی کے تگ و دو میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی رقمطراز ہیں:

''نظم جگنو اور بچہ میں جگنو کی زبانی بار بار یہ مصرع ''نہیں پیارے بچے یہ دن کھیلنے کا'' دہرایا جاتا ہے تو اس بازگشت کی آواز سے بچہ رفتہ رفتہ مانوس و متاثر ہو جاتا ہے۔''[۱]

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکیڈمی، بمبئی، ص ۱۳۳

نظم ''جگنو اور بچہ'' سے بچوں کی نفسیات، ہٹ دھرمی اور ضد کے حوالے سے سامنے آتی ہے۔ یہ شاعر کے گہرے مطالعے کی دلیل ہے۔ لیکن نظم کے آخر میں بچے کو ضدی ہونے کے باوجود اسے موم کی طرح پگھلتے دکھایا گیا ہے۔ مثلاً

جو تو علم کی روشنی ہے تو آجا　　مرے دل میں میرے جگر میں سما جا
مجھے پڑھنے لکھنے کا شیدا بنا جا　　اگر اور کچھ ہے تو ہٹ جا، چلا جا
چمکدار کیڑے مجھے کھیلنے دے!

تلوک چند محروم لکھتے ہیں کہ:

''بچوں کے لئے نصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا مناسب نہیں بلکہ اسلوب کچھ اس نوعیت کا ہو کہ جو بھلائی ہم ان میں پیدا کرنا یا جس برائی سے انہیں بچانا چاہتے ہیں اس کی طرف کچھ ایسا اشارہ ہو کہ بچہ خود بخود اس اچھائی یا برائی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائے اور اس کا دل از خود نیکی کی طرف مائل ہو اور بدی سے تنفر ہو جائے۔'' [۱]

نظم ''جگنو اور بچہ'' کے بارے میں ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''جگنو اور بچہ میں اسی نوعیت کا اسلوب ملتا ہے کہ بچہ کے دل میں علم کی فضیلت گھر کر جاتی ہے۔'' [۲]

جگنو اور بچہ کی طرح سیماب کی نظم ''بلبل اور گلاب'' بھی مکالماتی انداز کی نظم ہے۔

۱۔ بہار طفلی، تلوک چند محروم، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۷۰

۲۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، ص ۱۳۳

یہ بھی انھوں نے بچوں کے ذہن کو بالیدہ کرنے کے لئے لکھی ہے۔ نظم بلبل اور گلاب بڑی عمر کے بچوں کے لئے ان کے مزاج اور رجحان کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس نظم سے دو بند ملاحظہ ہوں:

ہو:

بلبل: پیارے مرے اے گلاب کے پھول — اے گلشن لاجواب کے پھول
رنگین، خموش، سیدھے سادے — اے ملک چمن کے شاہزادے
کرتی ہے بہار جب کنارا — ہوجاتا ہے زرد باغ سارا
آتا نہیں کیوں مجھے نظر تو؟ — جاتا ہے چھپا چھپا کدھر تو؟
مرجھاتی ہیں تیری ساری کلیاں — رہتی نہیں پھر یہ رنگ رلیاں
اڑ جاتی ہے بو حنا کی مانند — ہوتا ہے فنا، ہوا کی مانند

گلاب: اے مطربۂ بہار بلبل! — اے عاشق بے قرار بلبل!
ہوتا ہوں میں خاک ہی سے پیدا — آخر کو ہوں خاک ہی میں ملتا
غمخوار بھی غمگسار بھی ہے — ماں بھی ہے یہی مزار بھی ہے
دنیا میں ہیں جتنے پھول کلیاں — ہے سب میں بقا فنا نمایاں
مرجھا کے ہر ایک پھول پتا — ہوتا ہے پھر اس زمین سے پیدا

ہر پھول میں ہے خدا کی قدرت
ہر خار میں ہے اسی کی حکمت

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے سیماب کا یہ وصفِ خاص ہے کہ انھوں نے اپنی نظمیں

بچوں کے فہم وادراک اور ذہنی ارتقاء کی مناسبت سے لکھی ہیں۔ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''بلبل اور گلاب میں ایک ایسی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے جسے بڑے ہوکر بھی سمجھنا دشوار ہی ہوتا ہے۔لیکن طرزِ ادا کی دلکشی اور اسلوب بیان نے بچوں کے ذہن میں اس مسئلے کے اترنے کے لئے بہت کچھ گنجائش نکال لی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ نظم بڑی عمر کے بچوں کے ادب میں شمار کی جائے گی۔'' [۱]

بچوں کے ذہنی نشو ونما کی خاطر لکھی گئی نظموں میں ''دعا'' اور ''بچوں کی دعا'' اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں نسبتاً چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔نظم ''دعا'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے راجا پرجا کے مالک — اے ساری دنیا کے مالک
اے دونوں عالم کے داتا — تیرا نہیں کسی سے ناتا
کوئی نہیں ہے تیرا ہمسر — تو ہے سب سے بالا برتر
ہم ہیں ترے در کے بھکاری — شرم ہے تیرے ہاتھ ہماری
جس کو چاہے عزت دے دے — جس کو چاہے ذلت دے دے
عزت ذلت کا تو مالک — دوزخ جنت کا تو مالک
مالک ہے تو دونوں عالم کا — خالق تو جن و آدم کا
چاہتے ہیں ہم تجھ سے عزت — دے دے مولا دے دے عزت
عزت دے ہم کو دنیا میں — راحت دے ہم کو عقبیٰ میں
یاد سے اپنی شاد ہمیں کر — دنیا میں آباد ہمیں کر

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، ص ۱۳۳

عقل بھی دے اور علم عطا کر　　فہم بھی دے اور حلم عطا کر
عشق کی بو موجود ہو دل میں　　تو ہی تو موجود ہو دل میں
بن جائے ہر کام ہمارا
حق پر ہو انجام ہمارا

اسی طرح ان کی دوسری نظم ''بچوں کی دعا'' ہے۔اس سے بھی چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

اے میرے والی　　اے رکھوالی
اے میرے داتا　　اے میرے آقا
سب کے مولیٰ
سب سے اولیٰ
علم و ہنر دے　　بھر دے بھر دے
صحت بھی دے　　دولت بھی دے
عزت بھی دے
راحت بھی دے
میری دعا سن　　میرے خدا سن
دنیا　　تیری　　عقبیٰ　　تیری
تجھ سا کب ہے
تو ہی رب ہے

زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

''سیماب کی نظمیں بچے کی عمر کی ہر منزل کے لئے لکھی گئی ہیں۔ دنیا اور دنیا دار، تاج محل اور نور جہاں کا مقبرہ، بڑی عمر کے بچے ہی پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ سادگی الفاظ نہیں جو سات آٹھ سال کے بچے سمجھ سکیں۔ ساتھ ساتھ ان کا موضوع اور مفہوم بھی کم عمر کے بچوں کے لئے نا قابل فہم ہو جاتا ہے.....لیکن یہ بچوں کے ذہن کو بالیدہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔'' [۱]

اس حصہ کی مکالماتی نظموں میں دنیا دار دلچسپ نظم ہے۔ یہ بھی کم سن بچوں کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح تاج محل اور نور جہاں کا مقبرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جن کو صرف بڑی عمر کے بچے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نظم ''دنیا اور دنیا دار'' میں مکالماتی طرزِ ادا اختیار کیا گیا ہے اور اس نظم کے ذریعہ بچوں کو دنیا کے حوالے سے مثبت پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس نظم سے ایک مکالمہ پیش ہے:

دنیا: مر گئے تو یہ نشاطِ جاودانی پھر کہاں — یہ گلستاں، یہ بہار گلفشانی پھر کہاں
یہ تماشائے حیاتِ بزم فانی پھر کہاں — یہ زمیں اور یہ فضائے آسمانی پھر کہاں
سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی بھی رہی تو نوجوانی پھر کہاں

دنیادار: بندۂ مجبور ہوں نظروں کو رسوا کیا کروں — میں نشاطِ جاودانی کی تمنا کیا کروں
ہوں فسردہ سیرِ گلشن کا ارادہ کیا کروں — سیکڑوں جھگڑے ہیں میری جان کو کیا کیا کروں
زندگی بے کیف ہے عزم تماشا کیا کروں
مجھ پہ دنیا تنگ ہے میں سیرِ دنیا کیا کروں

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۱۳۳

سیماب کی ایک اور نظم ''تاج محل'' ہے۔ یہ نظم بھی بڑی عمر کے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس نظم سے نوحہ گری اور عبرت کی کیفیت سامنے آتی ہیں۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

یہ قصرِ مرمریں صنوخیز ہے جمنا کے پہلو میں　　تریا محوِ خواب ناز ہے، زہرا کے پہلو میں
ریاض سرمدی ہے کوثرِ رعنا کے پہلو میں　　کہ روحِ تازگی بالیدہ ہے دریا کے پہلو میں
مجسم اک جگہ انوار ممتاز جواں کے ہیں
اور آنسو اس کے قدموں میں رواں شاہ جہاں کے ہیں

سیماب نے بچوں کے لئے ہلکے پھلکے انداز کی اور بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ پستی بلندی ہر جگہ اپنے جلوے دکھاتی ہیں۔ ان نظموں میں شام کی دعا، میں ملک میں لکھ پڑھ کر بہت نام کروں گا، خدا وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جس کو پڑھنے کے بعد اس کے اثرات بچے کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں اور ان میں جوش ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نظم ''ملک میں لکھ پڑھ کر بہت نام کروں گا'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ملک کی خدمت سحر و شام کروں گا　　کاہل نہ بنوں گا نہ میں آرام کروں گا
جس کام میں بہبود ہو وہ کام کروں گا　　ہر کام غرض قابلِ انعام کروں گا
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

میں جانتا ہوں ملک کو کیا کیا ہے ضرورت　　پھر کیوں نہ کروں گا میں بھلا ملک کی خدمت!
مدت سے نہیں ہند میں مقبول تجارت　　کوشش میں کروں گا کہ بڑھے صنعت و حرفت
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

کھیتی کو ترقی نہیں گزرے ہیں بہت سال　　ہر سال کہیں جنگ ہے موجود کہیں کال

افلاس یہ پھیلا ہے کہ ملتا ہی نہیں مال　　بدلوں گا میں اس ملک کا یکبارگی یہ حال

میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

اسی طرح ان کی دوسری نظم ''شام کی دعا'' سے چند اشعار پیش ہیں:

شام ہوئی اور سورج ڈوبا　　رات نے اپنا خیمہ ڈالا

دھوپ کہاں، اب ہے اندھیارا　　سماں ہے ٹھنڈا پیارا پیارا

دن بھر خوب پڑھے اور کھیلے　　دیکھے اس دنیا کے میلے

یاد کرو سب دن کی باتیں　　کیا کیا کام کئے تھے دن میں

کس کو مارا، کس کو لوٹا　　لڑنے میں کس کا سر پھوٹا

مانگو اپنے رب سے دعائیں　　یا رب سر سے ٹال بلائیں

شام سویرے کا تو مالک　　اور اندھیرے کا تو مالک

صبح بھی تجھ سے شام بھی تجھ سے　　ہے ان کا انجام بھی تجھ سے

نام تیرا میں لے کر جاگوں　　کھاؤں پیوں اور دوڑوں بھاگوں

کھیلوں کودوں اور پڑھوں میں

شاد رہوں آباد رہوں میں

نظم ''شام کی دعا'' کا اسلوبِ بیان سادہ اور ہلکا پھلکا ہے۔ اس میں بچوں کے ذہنی رجحان، جذبات اور کردار اور خدا پر ان کا یقین سبھی چیزیں موجود ہیں جو بچوں کے ادب کے اعتبار سے حقیقی معنویت رکھتی ہیں۔ اور بچوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتی ہیں۔ گزشتہ نظموں کا آہنگ، اسلوب اور طرزِ تحریر بچوں کے ذہنی معیار کے مناسب ہے۔ غرض بچوں کے اذہان کی نشو و نما اور شعور کی بالیدگی، ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر و تشکیل میں سیماب صاحب کی تخلیق کردہ بچوں کی نظمیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

''شعرِ انقلاب''

''نے ستاں''، ''کارِامروز''، ''ساز وآہنگ''، ''سرودغم، نفیرغم'' اور ''عالم آشوب'' کے بعد موضوعی شاعری کی شکل میں سیماب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''شعر انقلاب'' ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ غزلیات کے تینوں مجموعے ان سے الگ ہیں۔ نیستاں کی نظموں کے چار حصوں میں سے دو تو خالص مذہبیت اور روحانیت سے معمور ہیں، بعد کے دو حصوں میں تاج محل، ارضِ تاج، جنت کے خطوط اور بعض روحانی نظمیں ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ اس کو سیاست یا انقلاب کی ہوا تک نہیں لگی البتہ کارِامروز میں وہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی اور ادبی مسائل پر بہت انہماک سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے میں مختلف اور متنوع قسم کی نظمیں ہیں جن میں وطن اور سیاست سے متعلق موضوعات خاصے نمایاں ہیں۔ اسی طرح ارضِ تاج اور مغلیہ خاندان کی یادگاروں کے تعلق سے سولہ نظمیں ہیں۔ جب کہ ''ساز وآہنگ'' میں قومیت، وطنیت، سیاست اور اخلاق و معاشرت پر اصلاحی رنگ غالب ہوکر ان کی لے اور تیز ہوگئی ہے۔ اس میں ملکی و عالمی تاریخ وسیاست پر بھی متعدد واہم نظمیں ہیں۔ یہاں شاعر ایک عظیم مصلح، مفکر اور مدبّر کی طرح اکثر جگہ منبر پر کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ''عالم آشوب'' کی رباعیوں میں شاعر دوسری جنگ عظیم کے اسباب ونتائج اور اس کی تباہ کاریوں پر کھل کر اظہار خیال کرتا ہے اور عالمی سطح پر ہونے والے ظلم وستم اور سفّاکی کا آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ رباعیاں پڑھ کر ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والے قومی وملکی رہنما اور صاحبِ قلم کی جرأت مندانہ کاوشوں سے اچھے اچھوں کے دل مرتعش ہوجاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آجاتا ہے کہ اسی شاعر کو انقلابی شاعری کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ وہ شاعر جو باہم محبت، اتحاد و یگانگت اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر

بھائی چارگی کا نقیب ہے، ایک بڑے سرجن کی طرح پھوڑے کا آپریشن کر کے فاسد مادّہ نکالنے پر راضی و مجبور ہو جاتا ہے۔

شعر انقلاب کی پوری شاعری سیماب کے اسی طرح کے اصلاحی و انقلابی رنگ اور طرز بیان کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ مجموعہ ان کے کلام میں خاص اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔اس کی نظمیں قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ایک بڑے شاعر کی طرح ان میں پیغام بھی ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان میں سیماب نے نہ صرف عصر حاضر کے مسائل پر تنقید کی ہے، اور انقلاب کی دعوت دی ہے بلکہ خرابیوں کو دور کرنے کے مؤثر اور مفید طریقے بھی تجویز کئے ہیں۔اس کی نظموں میں ''بھوکا ہندوستان''، ''پھوٹ کا گیت بین الاقوامی ساز شکستہ پر'' اور ''صبح بنارس'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

نظم ''بھوکا ہندوستان'' میں شاعر نے تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس ملک میں بکثرت تاریخی و مذہبی عمارات، متمدن شہر، تفریح گاہیں، ندیاں، غلّے، میوہ جات اور معدنیات ہوں، وہاں کے لوگ بھوکے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جہاں تاج محل، قطب مینار، جامع مسجد، ایلورا، دولت باغ، شالا مار جیسی یادگاریں اور مذہبی، تہذیبی اور تاریخی وراثتیں اور بندرابن کے مندر، امرتسر کا گرودوارہ، شوالے، مسجدیں ہوں، جہاں دہلی، آگرہ اور لاہور جیسے شہر، گنگا، جمنا اور جھیلم جیسی ندیاں ہوں، وہاں کے لوگ بھوکے ہوں یہ ناممکن ہے۔شاعر نے اس نظم میں نہ صرف ہندوستان کی بھوک کا تذکرہ کیا ہے بلکہ اس کی حقیقت تک رسائی کی کوشش بھی کی ہے۔ سیماب کہتے ہیں ؎

بھوکے ہیں خود ہندوستانی بھوکا ہندوستان نہیں

بھوکا ہندوستان کو کہنا، آگاہی کی شان نہیں

بھوک ہے یہ روحانیت کی، بھوکا ہندوستان نہیں

سیماب کے نزدیک ہندوستان بھوکا نہیں، بلکہ ہندوستانی بھوکے ہیں، اور ان کی بھوک کا سبب یہ ہے کہ ان کے اندر روحانیت مفقود ہے۔ اگر وہ روحانیت کو حاصل کر لیں تو ان کی بھوک بھی کافور ہو جائے گی۔

شاعر نے لوگوں کی بھوک کا علاج بھی تجویز کیا ہے اور علاج یہ ہے کہ لوگ اپنے مذہب کی تعلیمات کو اختیار کریں اور خدا کو یاد کریں۔ وہ چاہے جس مذہب کے ماننے والے ہوں، اگر انھوں نے اسے اپنایا، تو ان کی بھوک دور ہو سکتی ہے۔ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ وہ صدقہ اور دان دیں اور ایمان کی دولت حاصل کریں۔ ساتھ ہی ظلم و تکبر سے بچیں:

بھول گئے ہیں یہ مذہب کو دل میں خدا کی یاد نہیں

قرآں، وید، گرنتھ سے یعنی ان کے گھر آباد نہیں

دان اور پُن صدقہ دینے کا احساس نہیں

دولت تو ہے اب بھی لیکن ایماں ان کے پاس نہیں

جو اپنے رزّاق کو بھولے رزق اُسے دے کون یہاں

جس کے پاس نہیں کھانے کو وہ بھی ہے فرعون یہاں

اس مجموعے کی ایک اور اہم نظم ''پھوٹ کا گیت بین الاقوامی ساز شکستہ پر'' ہے جس میں شاعر نے پھوٹ کی فتنہ سامانیوں، اس کے دارۂ اثر اور اس کی خصوصیات کی نشاندہی مؤثر پیرایے میں کی ہے۔ ''پھوٹ'' یعنی ایک دوسرے کے درمیان اختلاف پیدا کر کے فساد

پھیلانا۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جس سے فتنہ وفساد اور خانہ جنگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ شاعر نے ہندوستان میں اس کی موجودگی کو بین الاقوامی نشانی قرار دیا ہے۔ انگریزوں نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے اصول پر برسوں عمل کیا اور ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر کے اپنی حکومت مضبوط اور وسیع کرنے کا وسیلہ اسی صفت کو بنایا۔ ہر شخص اپنے فرقہ کی اہمیت کو ترجیح دینے لگا اور حب وطن اور وطنی اتحاد سے بیگانہ ہو گیا۔ سیماب نے بہت خوبصورتی سے مکالماتی انداز میں پھوٹ کے فلسفہ اور اس کے تدارک پر گفتگو کی۔ یہ نظم تقسیم ہند سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس سے اس کے پس منظر کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو جاتی ہے:

فسادوں کی معاون، خانہ جنگی کی میں بانی ہوں

دیار ہند میں اک ''بین الاقوامی'' نشانی ہوں

شاعر نے اس کے مسکن و مراکز کی نشان دہی بھی کی ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تقدس کے مراکز بھی اس کے فروغ کا باعث بن جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں یہ اشعار تخلیق کئے گئے، اس وقت یہ جذبہ نہ صرف بہت طاقتور تھا، بلکہ اپنے ملک سے اتفاق و اتحاد رخصت ہو کر ملک عدم کو سدھار گیا تھا اور ''پھوٹ'' کی لعنت نے اس کی جانشینی اختیار کر لی تھی۔ پھوٹ و نزاع کے اس بیان میں زبان کی سادگی، سلاست، روانی و بے تکلفی کے ساتھ تخیل کے ہنرمندانہ استعمال کے سبب پوری نظم کے اشعار میں تاثیر اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مکالماتی طرز اظہار کے ساتھ خود پھوٹ کا اپنے بارے میں درج ذیل اظہار خیال بڑی معنویت و ادبیت کا حامل ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

کبھی مسجد مرا گھر ہے، کبھی مندر مرا مسکن

تقدس کے حجابوں میں ''تکدر'' کی کہانی ہوں

کوئی ہندوستاں میں میرا ہمسر ہو نہیں سکتا
میں تنہا جانشینِ ''اتفاق'' آں جہانی ہوں
مرے سیل تعصب سے ابھرنا غیر ممکن ہے
عقائد کا طلاطم ہوں، مذاہب کی جوانی ہو
کروں میں غور شاید اس وطن سے کوچ کرنے پر
اگر ہر فرد یہ کہہ دے کہ میں ہندوستانی ہوں

آخری شعر میں پھوٹ نے ہندوستانی سماج سے اپنے کوچ کرنے کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے جو قابل غور و عمل ہے، اور یہی سیماب کا تخلیق نظم کا مقصد ہے کہ ہر شخص اپنے فرقے یا گروہ کے محدود جذبات کو تیاگ کر پورے وطن سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔

اس مجموعے کی ایک اور نظم ''صبح بنارس'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے گنگا کے کنارے کے دو متضاد مناظر کو پیش کیا ہے۔ اور منفی منظر پر تنقید کی ہے۔ دراصل گنگا کے پانی کی ہمہ جہت خوبی و افادیت اور اس کے مذہبی تقدس کی حفاظت کی خاطر اس کی کثافت و آلودگی دور کرنے اور اسے ہر طرح سے پاک و صاف کرنے کے سلسلے میں سائنس دانوں اور عقیدت مندوں نے تو صرف گزشتہ بیس پچیس سال سے ہی راگ چھیڑا ہے اور اس کے لئے وزیر، بڑے بڑے افسر اور انجینئر، بڑے سے بڑے پروجیکٹ بناتے ہیں اور اپنی جیبیں بھرتے ہیں لیکن اب سے ۶۵ سال پہلے اردو کے ایک عظیم شاعر اور اپنے ملک کے نہایت دردمند، ہمدرد اور حساس محبّ وطن جناب سیماب اکبر آبادی نے اس ندی کے تقدس کا احساس اور اپنے جمالیاتی ذوق کا اظہار کرتے ہوئے اس کی صفائی رکھنے پر زور دیا اور اصرار کیا تھا۔ سیماب نے صبح کے وقت بنارس میں واقع گنگا کے کنارے صبح کا منظر بیان کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں بنارس میں گنگا کے کنارے صبح کے وقت لوگوں کے اشنان، پوجا پاٹ اور سیر وتفریح ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف اسی وقت گنگا کے کنارے ایک مرگھٹ میں لاشیں جلتی ہیں۔ شاعر یہ چاہتا ہے کہ گنگا کی حسین اور رومانی فضا کو باقی رکھا جائے اور اسے ان شعلوں اور اندر کی آلودگی سے محفوظ بنایا جائے۔ ندرت تخیل اور شاعرانہ حسن کے ذریعہ شاعر نے اپنے محسوسات وتاثرات کو پیش کیا ہے۔ نظم کے منتخب اجزاء ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:

سحر کی گود میں کیوں شام عبرت ناک ہو جائے
جواں نظروں کے آگے کیوں جوانی خاک ہو جائے

کنارے رود گنگا کیوں یہ مردے لائے جاتے ہیں
سرِ کوثر کہیں آتش کدے سلگائے جاتے ہیں

انھوں نے گنگا کی صفائی کے لئے اپنے وجدان سے یہ بہت اہم تجویز پیش کردی ہے:

نظر سے دور مرگھٹ کیوں نہ ہو تعمیر صحرا میں
وہاں سے راکھ لاکر کیوں نہ ڈالی جائے دریا میں

اگر ممکن نہیں اس رسم سے پہلو تہی ہونا
تو ہے دو چار ساعت بہتر اس کا ملتوی ہونا

سحر جب ساز رنگیں چھیڑ کر اپنا چلی جائے
تو پھر اس سوز غم افروز کو آواز دی جائے

یہ انتظام جیسا کہ عرض کیا گیا، اگرچہ ایک مخصوص مقام کے ایک جذباتی مسئلے سے تعلق رکھتا ہے لیکن گنگا کے اس منظر نے بہرحال شاعر کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیا ہے، اور

اپنی شاعرانہ حسیات کو استعمال کرتے ہوئے سیماب نے جہاں ایک طرف خوب صورت مناظر کی تصویر کشی کی ہے وہیں اصلاح طلب پہلو پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ چنانچہ اس نظم میں تخیل اور شعری وسائل کے استعمال کے سبب ادبی حسن اور انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔

''شعرِ انقلاب'' کی نظمیں سیماب کی دلی کیفیات و احساسات اور فنی مہارت کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے عہد کی ملکی اور سماجی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے، اور ان کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے۔ ساتھ ہی صحیح رویے اور طریق کار کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس کے مطالعے سے ذہن میں انقلاب کی دستک ہوتی ہے اور ایک عزم پیدا ہوتا ہے۔

بابِ سوم

سیماب کی غزل گوئی

(۱) کلیمِ عجم

(۲) سدرۃ المنتہیٰ

(۳) لوحِ محفوظ

غزل اردو کی سب سے مقبول اور ہر دلعزیز صنفِ سخن ہے۔لیکن اردو ادب کی تاریخ میں غزل ہی سب سے زیادہ ہدف ملامت بنی۔ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے رہے۔مولانا حالؔی نے اس کو بے وقت کی راگنی کہا اور غزل کی اصلاح کے لئے اپنے مشورے دیئے۔عظمت اللہ خاں نے غزل کی گردن بے تکلف اڑا دینے کی صلاح دی اور کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا۔لیکن غزل حالات کے ساتھ ساتھ بدلنے، خود کو ہر ضرورت اور زمانے کے مطابق ڈھالنے، ہر خیال اور جذبے کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کا ثبوت فراہم کرتی رہی۔ سیماب اکبرآبادی داغ کے شاگرد تھے اور مولانا حالؔی کے خیالات سے پوری طرح واقف اور بڑی حد تک متفق تھے۔ وہ بھی اس بات کے خواہاں تھے کہ غزل میں ایسے موضوعات پیش کئے جائیں جن سے قوم میں بیداری پیدا ہو سکے۔انھوں نے غزل کی گردن اڑا دینے کی بات تو نہیں کی لیکن اس کے آہنگ میں ترمیم وہ بھی چاہتے تھے۔ انھوں نے غزل کے قدیم رنگِ سخن کو بے فصل کا نغمہ قرار دیا۔ مثلاً کہتے ہیں:

سیماب غزل گوئی اب اس کے سوا کیا ہے
بے فصل کا اک نغمہ بے وقت کی شہنائی

انھوں نے اپنے خطبہ میں بھی ایک جگہ کہا تھا:

''میرا جذبۂ اصلاح یہاں تک حوصلہ مند اور گستاخ ہے کہ اگر اس سلسلے میں دار و رسن کا فتویٰ بھی کسی کی طرف سے مل جائے تو میں بخوشی لبیک کہنے کو تیار ہوں لیکن میں اپنی سالہا سال کی ادبی

خدمات کا حاصل یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ موجودہ شاعری
اور شاعروں میں ایک ایسا خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے جو اردو
شاعری اور شاعروں کو ملک وقوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید
اور کارآمد بنادے۔'' [۱]

غالباً اسی وجہ سے انھوں نے غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل وموضوعات کو داخل کیا اور اس صنف کو غیر ضروری پابندیوں اور جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے نئی تحریکوں اور بدلتے ہوئے نظام سے آشنا کیا۔ سیماب نے ندرتِ خیال، جدت بیان اور شگفتہ طرزِ ادا سے اپنی شاعری کو نئی آب وتاب بخشی۔ ان کی شاعری داخلیت وخارجیت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ مثلاً وہ خود کہتے ہیں:

فکر کو سیماب آزادی کی دے کر وسعتیں
مرتبے ہم نے غزل کے بہت نہایت کر دیئے

عام شعراء کی طرح سیماب نے بھی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے ہی کی۔ انھوں نے کمسنی میں ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی اور اس دور میں بھی غزل ایک حد تک وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ اگر چہ ان کے یہاں بھی شروع میں مروجہ شاعری کی خصوصیات ملتی ہیں۔ مثلاً ابتداء میں ان کی شاعری پر داغؔ اور امیرؔ کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے ان کی غزلوں میں معاملہ بندی، ہجر وصال، گل وبلبل، شمع و پروانہ اور قفس اور آشیانہ وغیرہ جیسے الفاظ و اصطلاحات خاصی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ لیکن سیماب نے ان سے بھی نئے نئے موضوعات اخذ کر کے شاعری کو وسیع تر اظہار کا وسیلہ بنایا اور غزل میں مذہب، تصوف اور

۱۔ کلم عجم، سیماب اکبر آبادی، ص ۵۷

معاشرت کے موضوعات کو اختیار و استعمال کیا۔ انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ شاعری کو ایسے رخ پر ڈالنا چاہئے جس سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں احساسات و واردات بہت مؤثر ہیں، جذبات میں شدت ہے اور بصیرت میں گہرائی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے دیکھیں تو محاوروں اور جدید ترکیب کے خوبصورت استعمال نے ان کی غزلوں کو بہت شیریں اور لطیف بنا دیا ہے۔ انھوں نے تنگنائے غزل کو وسعت دینے کے لئے ہر قسم کے علمی و ادبی مسائل کے ساتھ ساتھ اخلاقی، سماجی، سیاسی، اصلاحی اور انقلابی عناصر، مسائل و موضوعات کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔ وہ اس موضوع پر کلیم عجم میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں، یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہوں۔ مری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے۔ اور تمام ضحائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہے۔ جس طرح علم شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ اور خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک بیان ہے گو مجھے تمام اصناف سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے، مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی

حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند الفاظ کا موید ہوں۔
ایسے الفاظ جس میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ
آسانی سمجھ سکیں۔'' [۱]

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، سیماب نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا اور اس صنف میں انھوں نے بتدریج ایک اعلیٰ اور امتیازی مقام حاصل کرلیا تھا۔ ابتداء سے ۱۸۹۸ء تک کی غزلیات بقول سیماب محفوظ نہیں رہیں۔ اس کے بعد کے کلام کو تدریجی اور زمانی ترتیب کے لحاظ سے انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''صہبائے کہن'' ۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۹ء، دوسرا حصہ جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک کے زمانے پر مشتمل ہے اس کا نام انھوں نے ''بادہ دوشیں'' رکھا اور تیسرا حصہ وہ جسے ان کے زمانۂ بلوغت و بلندی کا کلام کہہ سکتے ہیں اسے ''نشیدِ نو'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اور ان تینوں حصوں کے مجموعے کا نام ''کلیم عجم'' ہے جو ان کے چودہ خطباتِ شاعری کے ساتھ مجلد کیا گیا ہے۔ یہ خطبات اس جلد کے پہلے حصے میں شامل ہیں اور ہر صفحہ کے اوپر داہنی جانب ''خطبات شاعری'' اور بائیں جانب ''کلیم عجم'' لکھا ہوا ہے۔ خطبات کا حصہ ختم ہونے کے بعد جہاں سے غزلیات شروع ہوئی ہیں اس میں ہر صفحہ کے اوپر داہنی جانب اس تین حصوں سے متعلقہ شعری حصہ کا نام اور اوپر ہی بائیں جانب مکمل مجموعہ کا نام ''کلیم عجم'' لکھا ہوا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مجلد میں کلیم عجم کے تینوں حصے مذکور زمانی ترتیب کے برعکس شامل کئے گئے ہیں۔ یعنی اس وقت تک کے آخری زمانے کے کلام کو ''نشیدِ نو'' کو سب سے پہلے، دوسرے نمبر پر ''بادۂ دوشیں'' کو اور سب سے آخر میں ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۸ء تک

۱۔ کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۱۷۰

کے کلام کا مجموعہ ''صہبائے کہن'' شامل کیا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال علامہ اقبال کی ''بانگ درا'' کی ترتیب کے بالکل برعکس ہے۔

کلیم عجم اپنی لفظیات اور تراکیب کی ندرت کی بدولت اہلِ علم ونظر کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ یہ مجموعہ ان کی اصلاحی، اخلاقی اور مذہبی غزلوں پر مبنی ہے۔ خطبات شاعری میں ایک جگہ سیماب نے لکھا ہے:

> ''میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں خیال کرتا ہوں، غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہوسکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ مضبوط ولطیف، پُرشوکت ونغمہ بار ہوں اور خیالات و جذبات بلند و پاکیزہ ہوں۔''[۱]

''کلیم عجم'' سیماب کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ''کارِ امروز'' کے بعد چھپا۔ کلیم عجم کا تمام کلام ۱۸۹۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ سیماب کی غزلیں اعلیٰ وارفع فکر وخیال کا آئینہ بھی ہیں اور بعض غزلوں میں کیف وسرمستی اور مدہوشی وسرشاری بھی موجود ہے۔ لیکن سیماب کی اس مدہوشی وسرمستی میں جنسی تلذذ کا عنصر کہیں شامل نہیں ہے۔ ان کے خیالات میں پاکیزگی اور جذبے میں صداقت ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں تقدس و طہارت اور وقار وتمکنت کا وہ انداز ملتا ہے جو ان کی شاعرانہ انفرادیت و شناخت متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ حسن وعشق کے بیان کے ساتھ ہی ساتھ ان کی متصوفانہ اور مذہبی فکر سے ان کے گہرے شغف کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

۱۔ کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۸۶

سیماب کی غزلوں کے مطالعہ کے لئے ان کے خیالات، موضوعات و اسالیب کی نوعیت ملحوظ رکھتے ہوئے درجہ ذیل عناوین قائم کئے گئے ہیں جس سے ان کے فکر و خیال اور فن و اسلوب کی وسعت و کثیر جہتی کا اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے اور اردو غزل میں ان کے مقام متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ سیماب کی غزلوں کے اہم موضوعات

(الف) حسن و عشق (ب) صوفیانہ اور فلسفیانہ افکار (ج) صوفیانہ اور رومانی خیالات کی ہم آہنگی (د) رومانی تصورات

۲۔ عصری اور زمانی پس منظر

۳۔ مختلف مذہبی ماخذات اور اثرات کا شعری اظہار

۴۔ دیگر شعراء کے اثرات

۵۔ سیماب کا شعری اسلوب

(الف) حسن و عشق

سیماب کی غزلوں کے اہم موضوعات میں حسن و عشق کا موضوع خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی غزلیں حسن و عشق کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک وہ دور ہے جس میں کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا.....دن کا کچھ حصہ شعر کہنے کے لئے نہ نکال دیتا تھا وہ ذوق و شوق کے زمانے، ولولے اور امنگوں کے دن، ذہن

ودماغ کی آزادی کا موسم دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ ۱۹۱۸ء تک
سیماب صاحب کی زندگی کے ۳۸ یا ۴۰ سال پورے ہونے میں
اس زمانے تک ولولے اور امنگوں کے دن تھے۔'' [۱]

یہی وجہ ہے کہ غزل میں جب سیماب عشق ومحبت یا وحشت وجنوں کی باتیں کرتے ہیں تو سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ جذبات واحساسات پر مبنی تاثرات کا طوفان اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور ہر صاحب قلب ونظر اس پر وجد کرتا نظر آتا ہے۔ ایسے بے شمار اشعار میں سے چند درج ذیل ہیں۔

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

بچھڑ گیا ہے مرا کاروانِ حسن و وفا
اب آپ اپنی محبت کی یادگار ہوں میں

کچھ محبت ہی سے ہے ضد سب کو
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
محبت کی بلند اونچائیوں کا کیا ٹھکانہ
فرشتہ بھی شریکِ دودِ انساں ہونہیں سکتا

۱۔ غلام مصطفیٰ خاں، ص ۱۳۸

مزاجِ حسن میں تبدیلیاں پیدا نہیں ہوتیں
محبت گا رہی ہے اک ہی افسانہ برسوں سے

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیماب کی عشقیہ شاعری کا رنگ، روایت سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے یہاں عشق کا لفظ نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ وہ جب اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی روایتی یعنی محبوب سے عشق نہیں بلکہ مقصد سے عشق ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہوا اک معمول تھی میرے کردارِ محبت کا
مجھے تم سے نہیں، اپنی محبت سے محبت ہے

بھڑک کر حسن خاکستر بنادے ساری دنیا کو
جو بھولے سے بھی کہہ دوں، مجھے کس سے محبت ہے

خود مجھ کو انتظار کی لذت میں کھودیا
اب خود تڑپ رہے ہیں میرے انتظار میں

محسوس کررہا ہوں انھیں دل میں دیکھ کر
جیسے ہے کائنات میرے اختیار میں

سیماب کا عشقیہ کلام جسم ہی پر نہیں بلکہ براہِ راست روح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے غزلیہ مجموعوں میں بیشتر مقامات ایسے ہیں جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سیماب حسن و عشق و محبت کے صحیح رازدار ہیں۔

ان کی غزلوں میں حسن وعشق کی پاکیزگی اور فکر وخیال کی ندرت ونفاست کا مؤثر اظہار ہوتا ہے۔ان کے عشق میں ایک نیا پن، دلکشی، بلندی اور حوصلہ مندی ملتی ہے۔مثلاً

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

رسم ان سے محبت کی ادا بھی نہیں ہوتی
اور اب تو سلیقے سے جفا بھی نہیں ہوتی

پاؤں پھر راہِ محبت میں تھکے جاتے ہیں
پھر تمنائے درِ یار رہی جاتی ہے

یہ کسی نے شاخِ گل لاکر قریب آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پہ زباں رکھ دی

ان کی محبت کی اس منزل کا ایک راستہ اور بھی ہے جہاں پر عاشق ومعشوق کے درمیان کی دوریاں ختم ہوجاتی ہیں اور عبد اور معبود ایک دوسرے سے اتنے قریب تر ہوجاتے ہیں کہ دونوں کی ذات کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔

ہے حسن ایک جھلک میرے عشقِ تمام کی
اپنی ہی اک ادا پہ مٹا جارہا ہوں میں

حریمِ حسن، فردوسِ محبت کعبۂ فطرت
خدا جانے وہ کیا کیا ہے جسے میں دل سمجھتا ہوں

میری ہستی میری ہستی نہیں ہے
تمہیں تم ہو تو ذکرِ ماسوا کیا

یوں تو فتادگی ہے مذاقِ سرِ نیاز
سجدہ وہ تھا جو تیرے قدم پہ ادا ہوا

حسن وعشق کی پاکیزگی اور فکر وخیال کی ندرت کا اظہار اس سے زیادہ تر ادا کرنا آسان نہیں ہے۔ ان اشعار میں جذبے کی صداقت کے ساتھ روحانی کیفیات کا ترفع اور وجدوحال کی ایک کائنات پوشیدہ نظر آتی ہے۔

(ب) صوفیانہ افکار

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں میں تصوف سے معمور خیالات بھی جابجا ملتے ہیں۔ بعض اشعار جو خالص متصوفانہ خیالات کے حامل نظر آتے ہیں۔ خارجی نگاہیں بسا اوقات ان میں بھی رومانی تصورات تلاش کرلیتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزلوں میں پیش کردہ تمام افکار ایسے نظر آئیں گے جو سیماب کی افتادِ طبع کے عین مطابق ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش ہیں:

تو نے دیکھا نہ ہمیں نیم نگاہی سے کبھی
ہم نے پھر بھی تری محفل سے کنارہ نہ کیا

تو نے ہمارے ظرف نظر پر نہ کی نگاہ
سارے جہاں کو حسن سے معمور کردیا

راہِ سلوک میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے، جب سالک حیرت و استعجاب کی نظروں سے کارخانۂ قدرت کی حسن کاریوں اور نیرنگیوں کو دیکھتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار سیماب کے یہاں اس طرح کے اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے:

عروس فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا شباب ترا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب ترا

سیماب کے مطالعۂ کائنات کا دانش مندانہ عمل اس شعر میں خوب واضح نہیں ہوتا ہے جس کا انجام اضطراب بخش بھی ہے اور اطمینان بخش بھی۔

دکھا کے حسن کے پردوں میں اپنے نقش و نگار
ہلاک جلوۂ نور و ظہور تو نے دیکھا

صوفیہ راہ عشق میں اس منزل پر پہنچنا اپنے عشق کی معراج سمجھتے ہیں جہاں عاشق و معشوق کے درمیان حائل تمام پردے چاک ہو جائیں اور قرب کا یہ عالم ہو کہ: من تو شدم تو من شدی — من تن شدم تو جاں شدی اور سیماب کے یہاں بھی یہ کیفیت کہیں کہیں پوری بشارت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مثلاً

ہے حسن ایک جھلک میرے عشقِ تمام کی
اپنی ہی اک ادا پہ مٹا جا رہا ہوں میں

حریمِ حسن، فردوسِ محبت کعبۂ فطرت
خدا جانے وہ کیا کیا ہے جسے میں دل سمجھتا ہوں

میری ہستی میری ہستی نہیں ہے
تمہیں تم ہو تو ذکرِ ماسوا کیا

یوں تو فتادگی ہے مذاقِ سرِ نیاز
سجدہ وہ تھا جو تیرے قدم پہ ادا ہوا

دراصل تصوف کا موضوع بجائے خود بہت وسیع ہے۔ متصوفانہ افکار کے زیر اثر بعض دوسرے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں جیسے کائنات، خالق کائنات اور ان دونوں کا باہمی رشتہ، ہمہ اوست ہمہ از اوست، جبر وقدر، دنیا کی بے ثباتی، فنا و بقا، رضا وقناعت وغیرہ اس ضمن میں سیماب نے اپنے خطبہ میں درست ہی لکھا ہے:

> متصوفانہ شاعری میں ہماری عام اور مجازی مصطلحات شاعری کا درجہ روحانیت سے متوازن کر دیا گیا ہے شراب وساقی کا ذکر اس میں بھی ہے، ہجر و وصال کے جذبات اس میں بھی ہیں۔ کعبہ و دیر و کا نام اس میں بھی لیا جاتا ہے۔ قفس و آشیانہ اس میں بھی داخل ہیں لیکن شراب سے مراد شراب ذوق وشوق ساقی سے مراد پیر و مرشد، ہجر سے قرب الٰہی کا بعد اور فضل سے تقرب و نزدیکی کنایہ کی جاتی ہے۔'' [۱]

سیماب اگرچہ نہ فلسفی ہیں اور نہ صوفی لیکن غزل کے اس مزاج سے بخوبی واقف ہیں کہ صوفیانہ افکار اس صنف کا جزو لاینفک رہے ہیں۔ اسی لئے وہ کائنات میں جو کچھ دیکھتے

۱۔ کلیم عجم، ص ۱۵۴

ہیں اس کا فنکارانہ اظہار کر دیتے ہیں۔ سیماب کے مسائل تصوف بھی وہی ہیں جن پر ماضی میں بھی ہمارے شعراء اپنے خیالات کا اظہار کثرت سے کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ہر شئے میں خدا کا عکس وجلوہ موجود ہے۔ وہ دیر وحرم کی کوئی تفریق نہیں کرتے۔ قناعت کے سامنے بادشاہت کا تصور بھی ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا کو بے ثبات تصور کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

حریم عرش، محراب حرم، طاق صنم خانہ
اگر تم ہو نگاہوں میں تو سب کچھ ہے نگاہوں میں

یہ فرض کیوں نہ قدم پر تیرے ادا کرتے
نماز عشق تھی، سجدے زمیں پہ کیا کرتے

سیماب ہیں یہ راہِ قناعت کی ٹھوکریں
پہچانتا ہوں طرۂ تاج و کلاہ کو میں

شمع ہو گرمیٔ محفل ہو کہ پروانے ہوں
جسے دیکھا اسے اک رات کا مہماں دیکھا

کہانی ہے اتنی ہی قریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۵۷

عمر دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی باقی خیال میں

ان اشعار میں سالک وتصوف سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اس موضوع اوراس علم سے متعلق سیماب کے گہرے مطالعے اورشغف واستغراق کی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ وفورِشوق سے سرشار ہوکرعبادت میں اس طرح ڈوب جانا صوفی فکر کا وظیفہ ہے۔ عاشق کی معراج تو اسی وقت ممکن ہے جب معشوق کی نظر میں وہ محبوب بن جائے۔ سیماب نے حسن وعشق کی کیفیات اور وحدت الوجود کی گہرائیوں کوکس خوبصورت اورمترنم انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ ملاحظہ ہو:

عروس فطرت میری نگاہوں میں چھپا رہا شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب تیرا

زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہے تو
حدوث کی خفتہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا

غم عذاب وثواب کیسا؟ یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں
نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عذاب تیرا

سیماب نے یہ آخری شعرنصّ قرآنی کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ جوو تغیر من تشاءَ و تُذِلّ من تشا بیدك الخیرانک علیٰ کل شئی قدیر کی حقیقت کا ترجمان ہے۔

تصوف میں عاشق ومعشوق، ذرہ وصحرا، قطرہ و دریا اور جزوکل کی مناسبتوں اور

خامیوں کا بیان فنکارانہ انداز میں کیا جائے تو ایک طرف سالک پر جذب واستغراق کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور بیان کرنے والے کی عارفانہ عظمت کے تمام گوشے منور ہوجاتے ہیں، تو دوسری طرف تربیت یافتہ قاری روحانی ترفع اور وجدوحال کی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے۔ سیماب نے اپنے چھپے ہوئے خزانے، حسن ازل کے مشہور ہونے اور پھر آشکار ہونے پر سالک کے حیرت واستعجاب کا اظہار بڑے نازک طریقے سے کیا ہے۔

یہاں ہر جزو میں بھردی گئی ہیں قوتیں کل کی
وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

جزو کا کل میں سمانا ہی تو ہے کل ہونا
آہ وہ قطرہ جو گھبرا کے مندر سے چلا

قطرہ دریا ہے اگر شامل دریا ہو جائے
ذرہ اس بھید کو پاجائے تو صحرا ہوجائے

میری کیا انتہا ہو، جب نہیں ہے ابتداء کوئی
میں تھا موجود ارادوں میں کسی کے جب نہ تھا کوئی

برگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ
ہر ذرے کے حجاب میں اک آئینہ ملا

کسی کو تو نہ ملا اور کھودیا سب کو
تیری تلاش میں گمراہ اک زمانہ ملا

سیماب اکبرآبادی کے صوفیانہ اور فلسفیانہ افکار میں تازگی ہے، ان کے خیال میں ابہام اور اشکال نہیں ہے اور وہ اپنے تصورات ونظریات کا اظہار بہت واضح طور پر کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

(ج) صوفیانہ اور رومانی خیالات کی ہم آہنگی

سیماب کی غزلوں میں اکثر جگہ صوفیانہ اور رومانی خیالات ہم آہنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے لئے ان کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں جس میں رومان وتصوف کا امتزاج صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

دل کی آنکھوں سے تیرا میں نے نظارہ نہ کیا　　غیرتِ رشک نے اتنا بھی گوارا نہ کیا
مجھے مرہونِ غم دوست دوبارا نہ کیا　　آپ نے خوب کیا، درد کا چارا نہ کیا
خلوت دل نے کیا شمع تمنا کو پسند　　انجمن بن کے تجھے انجمن آرا نہ کیا
تو نے دیکھا نہ ہمیں نیم نگاہی سے کبھی　　ہم نے پھر بھی تیری محفل سے کنارہ نہ کیا
ادب آموز تھی پاکیزگیٔ نیت عشق　　بے وضو میں نے کبھی ذکر تمھارا نہ کیا

مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ ان کی متعدد غزلوں میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ کبھی کبھی تو حافظؔ کی طرح یہ امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ اشعار صوفیانہ ہیں یا رومانی، رومانیت کا اظہار کررہے ہیں، شاعر کا خیال ہے کہ پردہ یا جلوہ دونوں دراصل پردے کی شکلیں ہیں اور اسی لئے افکار واقرار اپنے آپ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

(د) رومانی تصورات

گزشتہ سطور میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ ان غزلوں کی تخلیق کے زمانے تک سیماب مذہبی مزاج کے شاعر تھے اور غزل میں متصوفانہ مضامین و مسائل کو پیش کرنے میں وہ بہت کامیاب رہے تھے، جس کی بنا پر انھیں صوفی یا عارف تصور کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس کے برعکس جب سیماب عشقیہ شاعری اور رومانی تصورات کی پیشکش پر آتے ہیں تو اس میں بھی کمال ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ غزل میں سطحی اور چھچھورا عشق پیش نہیں کرتے تاہم ان کی غزلیں اعلیٰ رومانی تصورات سے معمور ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں حسن و عشق کا وہ ارضی تصور پنہاں ہے جسے سیماب کی طبیعت کا بہت اہم میلان کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً

تسکین و محبت کے یہ دو ہی طریقے تھے
یا تم نہ بنے ہوتے یا دل نہ بنا ہوتا

عرصۂ حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے
جستجو تیری بڑی بھیڑ میں لے آئی ہے

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

(کلیم عجم)

مرکز پہ اپنے دھوپ سمٹتی ہے جس طرح
یوں رفتہ رفتہ تیرے قریب آرہا ہوں میں

تضحیک و التفات میں رہنے دے امتیاز
یوں مسکرا نہ دیکھ ہاں مسکرا کے دیکھ

محسوس کررہا ہوں انہیں دل میں دیکھ کر
جیسے ہے کائنات میرے اختیار میں

(سدرۃ المنتہیٰ))

جب کوئی مہر و وفا کا مجھ کو دیتا ہے فریب
دیکھ کر ماضی کی جانب مسکرا دیتا ہوں میں

نگاہِ ابر میں پھول اور کانٹے سب برابر ہیں
محبت اک نظر سے دیکھتی ہے دوست دشمن کو

جی چاہتا ہے عمر محبت نہ ختم ہو
مرجائے کسی کی تمنا لئے ہوئے

اس کے دل میں جذب کرکے اپنے دل کی دھڑکنیں
حسن کو احساس کے جذبے عطا کرتا ہوں میں

(لوحِ محفوظ)

مذکورہ بالا اشعار رومان انگیز تصورات کے آئینہ دار ہیں۔ سیماب کے ان اشعار میں ایسی ساحرانہ کیفیت موجود ہے جو قاری کے اوپر دیر تک اثر کئے رہتی ہے۔

(۲) عصری اور زمانی پس منظر:

(الف) عصری پس منظر کا تخلیق اظہار

سیماب کی غزلوں میں عصری حقائق، عصری پس منظر اور انفرادی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ایسے اثر انگیز اشعار بھی موجود ہیں جو جذبے کی صداقت سے ہم آہنگ ہو کر آفاق گیر حیثیت کے حامل بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار پیش ہیں:

صبوحی لا کہ وقتِ صبح ہے اے پیر مئے خانہ — تھکا ہارا ہے ساری رات کا ریگر مئے خانہ

وداع ہوش ہے ہر نفس پر تا پیر مے خانہ — وفورِ شوق سے گویا ہوں میں تصویر مے خانہ

مجھے پھر کھینچ لایا شوقِ دامن گیر مے خانہ — کدھر ہے ساقی کمسن، کہاں ہے پیر مے خانہ

نگاہیں مست ہو کر باریاب محفل ہو، ہوں — درِ کعبہ پہ کوئی کھینچ دے تصویر مے خانہ

الٰہی عمر بھر مجھ کو ملے افتادگی ایسی — سر صبا زدہ ہو اور پائے پیر مے خانہ

بہت دنوں میں اس جلوہ گاہ تک پہنچا
تجلیوں نے کیا خوب شرمسار مجھے

دل ترے تغافل سے خبردار نہ ہو جائے
یہ فتنہ کہیں خواب سے بیدار نہ ہو جائے

یہ اشعار اس خوف ناکی کا پرتو ہیں جو عہد حاضر کے ہر فرد کا مقدر بن گئی ہے۔ حقیقت کا اس قدر سچا اظہار سیماب کی غزلوں میں اس طرح گاہے بہ گاہے دکھائی دیتا ہے۔ ان اشعار کے علاوہ عصری پس منظر کا تخلیقی اظہار مزید ملاحظہ ہو:

کہیں جوشِ گل ہے سبو سبو، کہیں نکہتیں ہیں نمو نمو
یہ ہے اک قیامتِ رنگ و بو کہ طلوع صبح بہار ہے

جو کلی کھلے گی نہ صبح تک وہ بنے گی شمعِ شبِ چمن
سرِ شاخ پھول جو کھل گیا وہ چراغِ شام بہار ہے

(ب) وسعت مشاہدہ

مولانا حالؔی نے شاعری کی شرطوں میں تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ پر زور دیا تھا۔ سیماب اکبرآبادی مذکورہ تینوں شرائط بدرجۂ اتم پوری کرتے ہیں۔ خاص طور سے مطالعۂ کائنات اور وسعتِ مشاہدہ کے تو جگہ جگہ اور قدم قدم پر ثبوت ملتے ہیں۔ سیماب کی غزلوں میں مشاہدات کی وہ دنیا آباد ہے جو کسی شاعر کی کامیابی کا سبب بنتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

ہے حقیقت کی چمن کو جستجو میری طرح
رنگ و بو بھی ہے اسیر رنگ و بو میری طرح (کلیم عجم)

نہ چھیڑ اے تنگیٔ صحن چمن، پھر لوٹ جاؤں گا
تصور کی نگاہوں میں ابھی صحرا سلامت ہے

تحلیل ہو رہی ہے مری روح ہر نفس
تعمیر کائنات میں کام آرہا ہوں میں

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہہ دو کہ انتظار کرے، آرہا ہوں میں (سدرۃ المنتہیٰ)

وہ عرش سے دیتے ہیں اب دعوتِ نظارہ
اے ذوقِ نظر وقتِ معراج نظر آیا

پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کل کائنات پر
سمٹے تو اس قدر کہ رگِ جاں میں رہ گئے (لوحِ محفوظ)

(ج) بلند عزائم

سیماب کی غزلوں میں ایسے اشعار کی بھی خاصی تعداد ملتی ہے۔ جو جرأت شوق کے والہانہ اظہار کے سبب حوصلہ مندی کی علامت بن گئے ہیں۔ اور ان سے شاعر کی رفعت و بلندی کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً

کامیابی کی کوئی تدبیر جب کرتا ہوں میں
یہ سمجھ لیتا ہوں سر پر آسماں کوئی نہیں

چھوتی نہیں مجھے پرِ جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اڑا جارہا ہوں میں

مذکورہ بالا اشعار بلند حوصلہ اور عزم مصمم کی بھرپور شعری کیفیت سے مملو نظر آتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ انسان صرف مجبور محض نہیں بلکہ قطرہ بھی اپنے اندر دریا کی وسعت رکھتا ہے۔ سیماب کے چند اشعار مزید پیش ہیں جن میں ان کے عزم و اعتماد کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

یہاں ہر جزو میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کل کی
وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

جزو کا کل میں سمانا ہی تو ہے کل ہونا
آہ وہ قطرہ جو گھبرا کے سمندر سے چلا

قطرہ دریا ہے اگر شاملِ دریا ہو جائے
ذرہ اس بھید کو پا جائے تو صحرا ہو جائے

ستم بخیر! ہاتھ میں زورِ انقلاب
ذرّوں کو آفتاب سے ٹکرا رہا ہوں میں

یہ آخری شعر سیماب کے آہنی ارادے اور پختہ عزائم کی دلیل ہے۔ ہاتھ میں اگر زور انقلاب ہے تو ذروں کو آفتاب سے ٹکرانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ سیماب کی فطرت میں ذرّوں کو آفتاب سے ٹکرانے کا حوصلہ موجود ہے۔

(۳) مختلف مذہبی ماخذات اور اثرات کا شعری اظہار

سیماب مذہبی اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے پیرو تھے۔ چونکہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ سے غائیت درجہ کی عقیدت و محبت تھی۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ، سیرتِ رسول اور تاریخ اسلام کا ان کا زبردست مطالعہ تھا۔ ان کی غزلوں میں مذہب اسلام، توحید الٰہی، ہستی باری، سیرت النبی، باہمی رواداری اور عالمگیر برادری وغیرہ موضوعات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مختلف مذہبی ماخذات اور اثرات کا شعری اظہار بھی سیماب کے یہاں بہ درجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔ خدا مالک کل اور قادر مطلق ہے۔ اس کے نور کا ظہور ہر جگہ اور ہر شئے میں موجود ہے۔ اسی کے رحم و کرم پر دنیا آباد ہے۔ خدا کی تعریف و توصیف میں اردو کے بیشتر شعراء نے غزلیں لکھی ہیں، ان نظموں کو حمد کہتے ہیں۔ اس موضوع پر سیماب کے یہاں بھی بہت سی نظمیں اور اچھے اشعار موجود ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

عروس فطرت، میری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب تیرا

اگرچہ صبر آزما بہت ہے تیری خموشی و پردہ داری
مگر ہے دامنِ کشِ عقیدت سکوت تیرا حجاب تیرا

جلال و جبروت نے لگا دی ہے مہر حیرت زبان ولب پر
جبال و صحرا کے ذہن میں ہے اشارۂ انقلاب تیرا

مری رسائی سے دور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا

سیماب کے ان اشعار میں جو مذہبی پہلو نمایاں ہے وہ مذہبی ماخذات واثرات کے آئینہ داری ہے۔ شاعری کا جذبۂ عقیدت خدا کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

حرم اور دیر کے کتبے وہ دیکھے جس کو فرصت ہے
یہاں حد نظر صرف عنوانِ محبت ہے

مقصود بس ذاتِ خدا ہے۔ دیر وحرم تو بس ذریعہ ہیں اس تک رسائی کا۔ پھر شاعر آگے یہ کہتا ہے کہ:

بلندیوں کے لئے پستیاں مقدر ہیں
عطا ہوئی ہے جبین نیاز سر کے لئے

حریم عرش، محراب حرم، طاق صنم خانہ
اگر تم ہو نگاہوں میں تو سب کچھ ہے نگاہوں میں

پیدا کن جلوہ یہی پردہ ہے نظر کا
ہر وقت اس پردۂ حائل کی طرف دیکھ

دیتا ہوں داد فطرتِ حق آشنا کو میں
ہنگامۂ خودی میں نہ بھولا خدا کو میں

جنبش جو دوں نگاہِ حقیقت کشا کو میں
رکھ دوں الٹ کے پردۂ ارض و سما کو میں

سیماب کی غزلوں میں مذہبی نظریات کی وضاحت ایک خاص کیفیت رکھتی ہیں۔

(۴) سیماب کی شاعری پر دیگر شعراء کے اثرات

سیماب نے جس وقت شعر و شاعری کا آغاز کیا اس وقت اردو شاعری میں داغؔ و میرؔ کا غلغلہ بلند تھا۔ اگر چہ سیماب خانوادۂ داغ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انھوں نے ان کے مزاج و اسلوب کو بدلنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے اس سے الگ ہو کر میرؔ و غالبؔ کے ملے جلے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی اور غزل سے ابتذال و رکاکت کو دور کیا۔ میرؔ و غالبؔ کے پیرو ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں ان اساتذہ کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ مثلاً ان کی غزلوں میں غالبؔ کے اثرات کی کچھ جھلکیاں اس طرح دیکھی جا سکتی ہیں:

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

فطرت سے چوک ہوگئی میرے خیال میں — ہلکا سا رنگِ عشق بھی ہوتا جمال میں
صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں — امکاں ایک اور ظلم ہے قید محال میں
دنیا کرے تلاش نیا کوئی جامِ جم — اس کی جگہ نہیں ہے میرے جامِ سفال میں

غالبؔ کی غزل ''سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئی'' کی زمین میں بھی سیماب نے غزل کہی ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

کثرتِ تعمیر عالم وجہ بربادی ہوئی — بڑھ گئیں آبادیاں اتنی کہ ویراں ہوگئیں
میں نے جن اینٹوں پر آزادی کی رکھی تھی اساس — میری قسمت سے وہی بنیاد زنداں ہوگئیں

حکیم مومن خاں کے رنگ میں سیماب کی غزل ملاحظہ ہو:

نہ ہو گر آشنا نہیں ہوتا — بت کسی کا خدا نہیں ہوتا

تمہیں اس وقت یاد آتے ہو　　جب کوئی آسرا نہیں ہوتا
کچھ محبت ہی سے ہے ضد سب کو　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

سیماب کی غزلوں میں حالؔی کے رنگ کے اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہوں:

خود بین و خود شناس ملا خود نما ملا
انسان کے بھیس میں مجھے اکثر خدا ملا

یہ زمیں خود ایک دن کیا جانے کیا بن جائے گی
گر یونہی انساں پیوند زمین سوتا رہا

عمر دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی باقی خیال میں

دفعتاً ساز دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

سیماب داؔغ شاگرد تھے اس لئے فطری طور پر ان کے یہاں داغ کا بھی اثر موجود ہے۔ داؔغ کے رنگ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اس طرح مجھے ستا رہے ہو　　جیسے مرا خدا نہیں ہے

ہر چیز پر بہار ہر ایک شے میں حسن تھا
دنیا جوان تھی میرے عہدِ شباب میں

وہ شامِ فرقت، آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں، ساون کی جھڑیاں
آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی، ہائے محبت ہائے جوانی

ساون کی بھیگی بھیگی فضا میں دل کا فسانہ جاگ کے سننا
اپنی کہانی اپنی زبانی، ہائے محبت ہائے جوانی

مٹا دو خاک کر دو، پھونک دو کر دو فنا لیکن
ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے

یہاں اس بات کا اظہار نا مناسب نہیں کہ سیماب، داغؔ کے شاگرد ضرور تھے لیکن ان کے مقلد نہیں تھے۔ اسی لئے سیماب کا یہ مستقل رنگ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی طبیعتوں کے میلان میں بہت فرق تھا۔ داغؔ کی شخصیت میں شوخی، رنگینی، بے باکی، جرأت رندانہ اور حسن و شباب کی بے محابانہ ترجمانی ہے۔ ان کے یہاں سنجیدگی، ٹھہراؤ اور غور و فکر کا وہ عنصر موجود ہے جو اس زمانے کے شعری تقاضوں اور مطالبات کی تکمیل میں معاون ہوا۔ انھوں نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا تو غزل جدیدت کی طرف کروٹ بدل رہی تھی اور حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ اس لئے سیماب کی شاعری نہ جدید رنگ سے بیر رکھتی ہے نہ قدیم کو یکسر مسترد کرتی ہے۔ وہ دونوں کی اعلیٰ اقدار کی حامل ہے۔ چنانچہ فانیؔ کے رنگ کے اشعار سیماب کے یہاں اکثر نظر آ جاتے ہیں۔

کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم جہاں میں
پچھلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا
دینا مجھے مزید نوید حیات تم
جب لوگ جا رہے ہوں جنازہ لئے ہوئے

اقبالؔ کے رنگ میں سیماب کی متعدد غزلیں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو غزلوں کے نمونے پیش ہیں۔ اقبالؔ کی غزل ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' کی زمین میں سیماب کی یہ غزل ملاحظہ ہو:

غمِ عشق سے سرگراں اور بھی ہیں　　جہاں ہم ہیں شاید وہاں اور بھی ہیں
کچھ آج اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا　　میں سمجھا میرے رازداں اور بھی ہیں
بہت راز دنیا سے میں کہہ چکا ہوں　　کچھ اسرار دل میں نہاں اور بھی ہیں
میں اپنے نشیمن کی خیر مانگو　　میرے سامنے آشیاں اور بھی ہیں
اثر سوزِ پروانہ سے لینے والے　　یہاں چند آتش بجاں اور بھی ہیں

نہیں میں نواسنج سیمابؔ تنہا
بھرا باغ ہے، نغمہ خواں اور بھی ہیں

اقبالؔ کی دوسری زمین میں سیماب کی درج ذیل غزل بھی ہے۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر　　ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

جگرؔ کا رنگ سیماب کی غزلوں میں دیکھئے۔

میری رسائی سے دور ہے تو مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ سیماب نے مومنؔ، غالبؔ، داغؔ، اقبالؔ، فانیؔ، جگر وغیرہ شعراء کی زمین میں غزلیں کہی ہیں جن میں انھیں کے شایانِ شان شعریت موجود ہے۔

اردو کی شعری اصناف میں رباعی ایک اہم صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک مشکل ترین صنف شاعری ہے۔ اور اس کی مشکلات کا اعتراف اس صنف کو برتنے والے متعدد باکمال شاعروں نے کیا ہے۔ دراصل ہر صنف کے اپنے شعری تقاضے، آداب اور پابندیاں ہوتی ہیں۔ اور اس کی مخصوص ہستی اور جمالیاتی صورت ہوتی ہے۔ ان آداب اور پابندیوں سے عہدہ برآ ہو کر ہی کوئی شاعر اس صنف میں ارتقائی مراحل طے کر کے کمال کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ تخلیق شعر کی یہ پابندیاں جہاں کسی صنف سخن کی ہیئتی اور جمالیاتی صورت کی حفاظت کرتی ہیں، وہیں دوسری جانب شاعر کے جذباتی اور فکری ردعمل کی پیش کش میں رکاوٹ بھی ڈالتی ہیں۔ لیکن ایسا شاعر جو فکر رسا رکھتا ہو، زبان پر اسے ایسی ہی قدرت ہو کہ لفظوں سے کھیلے، لفظ اس کی فوج میں شامل ہو جائیں، اور تخلیقی وفور اس میں بدرجہ اتم موجود ہو، تو وہ فن کی ان حدود کو نہ صرف بآسانی عبور کر جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی وہ انھیں توڑ کر اور وسعت بھی دے دیتا ہے۔

رباعی میں چونکہ اشعار کی تعداد اور بحر متعین ہوتی ہے اس لئے شاعر کو دوسری اصناف کے مقابلے میں اس صنف میں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ رباعی صرف چار مصرعوں یعنی دو اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اور شاعر کو اپنی فکر یا خیال کو پوری طرح انہی چار مصرعوں میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس پر یہ بھی شرط ہے کہ تیسرا مصرع پُر زور ہو، یعنی یہ قاری کے خیال اور جذبہ آہنگ کو ارتقاعی سطح پر پہنچا دے، اور چوتھے مصرعے میں اس بنیادی خیال، فکر اور جذبہ کو نمایاں کیا جائے جو شاعر کا مقصد ہے۔ ان قیود کی روشنی میں رباعی پر غور کریں تو اس کے پہلے دو مصرعے شاعر کے خیال یا فکر کی فضا پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد دونوں

مصرعے بنیادی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کسی شاعر کے لئے اس صنف پر عبور حاصل کر پانا تبھی ممکن ہے جب وہ اس فن کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہو اس کی نظر وسیع اور مشاہدہ عمیق ہو۔ اس کے علاوہ وہ زبان کی نزاکتوں کو سمجھتا ہو اور اس کے تخلیقی استعمال پر قدرت رکھتا ہو تا کہ پوری قوت کے ساتھ وہ اپنا شعری اظہار کر سکے۔ جن شعراء نے رباعی میں طبع آزمائی کی ہے اور اچھا شاعر بن کر اپنی رباعیات کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں ان میں سے اکثر نے اس کے مشکل ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ فارسی رباعی کے مشہور و مقتدر شاعر حکیم خیام نیشاپوری نے لکھا ہے:

> ''رباعی مشکل ترین اقسام شعر است، زیرا مشروط و قیود سے کہ برائے آں نفر رشد و یایں کہ چوں دو بیت بیشتر نیست۔ مجال سخن درآں تنگ است۔'' [۱]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خیام جیسا باکمال اور زبردست شاعر جس نے فارسی ادب میں صنف رباعی کو ایک امتیازی حیثیت عطا کی اور جس سے اردو رباعی بھی ہمیشہ مستفید ہوتی رہی ہے۔ وہ اسے شاعری کی مشکل ترین اصناف میں شمار کرتا ہے۔ اور اس کے اسباب میں بھی وہ مذکورہ بالا چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔

رباعی کے فنی تقاضوں اور اس کی مشکلات کے حوالے سے ''رباعیات محروم'' کے دیباچے میں جوش ملیح آبادی نے بھی چند باتیں کہیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صنف پر قابو پانا شاعر کے لئے آسان نہیں۔ تجربے اور مشاہدے کی ایک طویل عمر گزارنے

۱۔ رباعیات حکیم نیشاپوری، مولفۂ فروغی، مطبوعہ تہران، ۱۳۲۱ھ، ص ۹

کے بعد ہی اس میں یہ اہلیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ رباعی میں اپنے احساسات وخیالات کو بخوبی پیش کر سکے۔ ان کا بیان ہے کہ:

''رباعی کہنا بڑا مشکل ہے۔ یہ وہ کم بخت صنف سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی ہے جب تک کہ زمانے کی سرد وگرم ہوائیں شاعر کی حساس ومفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی ہیں۔''[۱]

خود تلوک چند محروم رباعی لکھنے کے لئے مشق ومہارت اور پختگی عمر کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ امداد امام اثر نے رباعی کہنے کی دقتوں اور اس کے فنی مباحث پر گفتگو سے زیادہ اس کے موضوع پر کلام کیا ہے۔ اچھی اور کامیاب رباعی کے سلسلے میں وہ یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اس میں مضامین کی نوعیت حکیمانہ ہو یعنی ایسے مضامین جس میں شاعر نے کوئی اخلاقی یا مذہبی پہلو کو نظم کیا ہو۔ یا پھر اس کے ذریعہ وہ کسی معاشرتی اور تمدنی مسئلہ کی جانب لوگوں کو متوجہ کرے۔ لیکن اگر شاعر کا رجحان ''پست مضامین'' کی طرف ہو تو اس کی رباعی میں تاثیر پیدا نہیں ہوگی۔[۲] امداد امام اثر نے ''پست مضامین'' کی وضاحت اور نشاندہی نہیں کی ہے۔ البتہ ان کے اس قول میں حالؔی اور آزادؔ کے اصلاحی خیالات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعی گو شعرا کی تعداد بہت کم ہے۔ اس صنف

۱۔ رباعیات محروم، تلوک چند محروم، دیباچہ از جوش ملیح آبادی، اندرون ٹائیٹل

۲۔ کاشف الحقائق، امداد امام اثر، ص ۵۴۲

سخن کے مقابلے میں دیگر اصناف شعری مثلاً مثنوی، غزل، قصیدہ وغیرہ کا جائزہ لیں تو واضح طور پر ان میں شعرا کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ یہ صورتِ حال بھی رباعی کے مشکل صنف سخن ہونے کی ایک دلیل سمجھی جاسکتی ہے۔ اردو رباعی کے سلسلے میں برج موہن دتاتریہ کیفی کا یہ خیال بہت معنی خیز ہے کہ:

''رباعی ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے عموماً اس کی طرف کم توجہ ہوتی ہے۔''[۱]

اردو میں ایسے شاعر بہت کم گزرے ہیں جنھوں نے محض رباعی کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امجد حیدرآبادی کا نام یقیناً لیا جاسکتا ہے۔ جنھوں نے صرف رباعیاں ہی کہی ہیں۔ اردو کے جن دیگر شعرا کے یہاں رباعیات کے نمونے ملتے ہیں وہ بنیادی طور پر غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور نظم جیسی اصناف کے شاعر ہیں اور رباعیاں ان کی تخلیقی کاوشوں میں ثانوی درجہ رکھتی ہے۔

فارسی رباعی کو جو ترقی ملی وہ اردو رباعی کو نصیب نہ ہوسکی۔ دراصل فارسی زبان میں شروع سے ہی اس کا رواج رہا ہے۔ اسے دوبیتی بھی کہا جاتا تھا۔ اس میں بڑے بڑے صوفیاء اور درویشوں نے خوب خوب حصہ لیا۔ دیگر شعرا نے ثانوی صنف کی حیثیت سے اس میں اپنے فن کے جواہر پارے چھوڑے ہیں۔ چنانچہ صوفیاء نے مذہب، تصوف پر اس صنف میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اخلاق و فلسفہ کے مضامین کے تحت اس صنف میں اپنے فاضلانہ افکار پیش کئے اور اس صنف کو مالا مال کیا۔ اردو زبان و ادب کی عمر بھی کم ہے اس لئے بظاہر فارسی ادبیات سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال رباعی کا بھی ہے۔ یعنی عمر

۱۔ رباعیات محروم، از تلوک چند محروم، دیباچہ، دتاتریہ کیفی، ص ۱۷

کے تناسب سے اس کی رباعیات بھی کافی کم ہیں۔

اردو ادب میں رباعی نگاری دوسری اصناف کے تقریباً ساتھ ساتھ وجود میں آ گئی تھی۔ اور اس کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ کی ہے۔ اردو میں اس رباعی گوئی کا آغاز دکنی شاعر عبدالقادر سے ہوتا ہے جس نے ۱۷۰۰ء میں اردو کی پہلی رباعی کہی۔ دکنی شعرا کا رجحان دیگر اصناف کے مقابلے میں مثنوی کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے غزل وقصیدے میں بھی طبع آزمائی کی۔ رباعی کو وہاں کوئی خاص توجہ نہیں ملی تھی۔ دکن کے فتح ہونے کے بعد جب اردو زبان و ادب کا مرکز شمالی ہندوستان بنا تو دوسری اصناف کے ساتھ اس صنف کو بھی ترقی کا موقع ملا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ مغلوں کے زمانے اقتدار تک فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لئے اس دور میں شعراء کا فارسی شعر و ادب سے استفادے کا سلسلہ بھی بڑھ گیا۔ دلّی کے اہم ترین شعرا نے رباعی کی جانب توجہ مبذول کی۔ چنانچہ سوداؔ، میر حسنؔ، میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، انشاؔء، مومنؔ اور غالبؔ جیسے شاعروں نے رباعی میں اپنے فکر و فن کے اچھے نمونے پیش کئے۔ انیسؔ و دبیر نے بھی رباعیاں کہیں۔ یہ دونوں مرثیہ نگار جب مجلسوں میں جاتے تو مرثیہ سے قبل چند رباعیاں بھی پیش کرتے تھے۔ انیسؔ و دبیرؔ کی پیروی میں متعدد شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں۔ پیارے صاحب رشید نے بھی اس جانب خصوصی توجہ کی۔

آزادؔ اور حالیؔ کے زمانے میں نہ صرف شاعری، اردو ادب کے روایتی تصورات تبدیل ہوئے بلکہ تاریخ نے موضوعاتی لحاظ سے بھی اس میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ اس زمانے میں اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر حاوی تھا۔ چنانچہ اکبرالہ آبادی نے مشرق کی اخلاقی قدروں اور روایات کے تحفظ کے لئے طنزیہ انداز کی رباعیاں تخلیق کیں۔ اسی زمانے میں

اوراس کے بعد جگت موہن لال رواںؔ رباعیات کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ اقبالؔ نے بھی رباعیات کے ذریعہ اپنے مخصوص فلسفیانہ اوراصلاحی پیغام کولوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اقبالؔ کی نظموں کی طرح ان کی رباعیاں بھی بہت مؤثر اور پُرقوت ہیں۔

کسی فکر یا خیال کومؤثر اور پُرزور انداز میں کہنے کے لئے شاید رباعی سے بہتر کوئی اورصنف نہیں ہوسکتی۔ بہ شرط کہ شاعر کواس پر قدرت ہو۔ اس میں بڑی حد تک خطابیہ انداز موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اور سامع پر دوسری اصناف کے مقابلے میں اس کلام کا اثر زیادہ سرعت سے ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ بات بھی درست ہے کہ غزل کا شعر کسی موضوع فکر اظہار کے لئے مختصر ترین وسیلہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن غزل ایک شعر سے تو مکمل ہونہیں جاتی، اس میں کم از کم پانچ اشعار ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ اس کے اشعار کا آہنگ رباعی کے آہنگ کے مقابلے ہمیشہ پست ہوتا ہے۔ چنانچہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کی بھرپور قوت رباعی میں ہوتی ہے۔ رباعی کے اختصار اوراس کی اثر انگیزی نے بیسویں صدی کے بہت سے شعرا کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ ان شعراء میں اکبرؔ اوراقبالؔ کے علاوہ یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، امجد حیدرآبادی، آسی سکندر پوری، شفق جونپوری، فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بھی چند ایسے ہیں جن کا کوئی مجموعہ کلام مکمل طور پر رباعیات پر مشتمل ہو۔ البتہ فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم اور سیماب کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے۔

جدید شاعروں میں سیماب اکبرآبادی اپنی سیاسی وفکری شاعری میں سب سے انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعروشاعری سے ان کوفطری شغف تھا جس کی دلیل ان کی بسیار کلامی ہے۔ رباعی کواردو میں ابھی وہ مرتبہ اور مقبولیت نہیں ملی تھی جو فارسی شعروادب میں

اسے حاصل تھی۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو سیماب اکبرآبادی کی رباعیات کا مجموعہ ''عالم آشوب'' اردو رباعیات کے ذخیرہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس میں انھوں نے عصری زندگی کی ژولیدگیوں، ملکی و عالمی سیاسی مسائل کی پیش کش پر خصوصی توجہ کی ہے۔

سیماب اکبرآبادی کے کلام کے مطالعہ کی طرف نظم گو کی حیثیت سے اگرچہ بعض ناقدین نے توجہ صرف کی ہے لیکن ان کی رباعیات کے حوالے سے کوئی قابل توجہ کام سامنے نہیں آیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بسیار کلامی نے فنی لحاظ سے ان رباعیات کو کمزور کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ان رباعیوں کا ایک خاص تاریخی اور سیاسی پس منظر بھی ہے اور ان کی معنویت انھیں حوالے سے قائم ہوتی ہے۔ سیماب کی رباعیاں تاریخ کے ایک خاص حصہ یعنی دوسری عالمگیر جنگ کے حالات پر فوری ردعمل کی حیثیت رکھتی ہیں اور شاید اسی لئے ان میں فنی حسن کم سے کم تر ہے۔

سیماب نے اپنی رباعیوں میں مذہب، سیاست، جمہوریت، جنگ کی صورتِ حال، وطن پرستی، ہندوستان پر غیروں کے ظلم و جبر، مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں، ملکی اختلافات، سبھی پر اظہار خیال کیا ہے۔ خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے سبب جس طرح کا انتشار، بدامنی اور غیر محفوظ زندگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ ان کی رباعیات میں بہت نمایاں ہے۔

سیماب کی رباعیات کا مجموعہ ''عالم آشوب'' ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے آواخر مئی ۱۹۴۰ء سے آواخر دسمبر ۱۹۴۳ء تک کے سارے حالات بالترتیب قلم بند کئے ہیں۔ اس مجموعہ میں انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے وقت کے سیاسی حالات پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ یہ رباعیات اس وقت کی زندگی کی ایک مبسوط دستاویز بھی کہی جاسکتی ہیں۔ سیماب دنیا کے اس انقلابی دور کا پورا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے دنیا

کے مختلف ممالک کی تاریخ خاص طور سے سیاسی صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اس دور میں نہ تو امکان نشاطِ زندگی ہے اور نہ ہی ایسے پُرخطر دور میں جمہوریت کا ارتقاء ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود انھیں اس انقلاب سے صالح امیدیں وابستہ تھیں۔ ان کی رباعیات کے مجموعہ ''عالم آشوب'' کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جنگ کے ہر پہلو اور ہر ہر موڑ پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ سیماب کی رباعیوں کے سلسلے میں مخمور اکبرآبادی لکھتے ہیں:

> ''سیماب صاحب کی رباعیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے فلسفے کے بجائے سیاست حاضرہ کو موضوع بنایا۔ جوش کی رباعیوں میں مذہب اور سماج پر طنز ہے تو سیماب نے اس پیکر میں حوادث کے دوش بدوش اکثر کرداروں کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ یہ ایک خوش آئند انحراف اور ایک مفید اضافہ ہے۔ سیماب کی رباعیات بلندیٔ فکر اور عمیق نظر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ماہ بہ ماہ ترتیب کے التزام سے اس مجموعہ میں ایک تاریخی تسلسل بھی پیدا ہوگیا ہے۔'' [۱]

یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جس طرح انسانیت کا قتل ہوا اور انسانیت کو پامال کیا گیا اس پر سیماب کی حساس طبیعت بے چین ہواٹھی۔ چنانچہ ان کی رباعیات کے مجموعے میں تقریباً ہر تیسری یا چوتھی رباعی اس صورت حال کے خلاف شاعر کا ردعمل پیش کرتی ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ عالم آشوب، سیماب اکبرآبادی، پیش لفظ مخمور اکبرآبادی، ص۔س

دنیا کا یہ دور انقلاباتی ہے ہر چیز فنا ہوئی چلی جاتی ہے
آتے ہیں جو مغرب سے ہوا کے جھونکے جلتے ہوئے خون کی چراند آتی ہے

لندن میں وہ دورِ ارغوانی نہ رہا پیرس میں وہ ذوق نغمہ خوانی نہ رہا
یورپ میں ہوئی موت کی وہ ارزانی امکانِ نشاطِ زندگانی نہ رہا

دنیا کا یہ انتشار توبہ توبہ! انسان کی گیر و دار توبہ توبہ
یہ چاندنی رات اور یہ بمباری ہنگامۂ نور و نار توبہ توبہ

ان تینوں رباعیوں میں انسانی زندگی کی پامالی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ یقیناً دردناک ہے۔ محض سیاسی بالادستی کے لئے کروڑوں معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایک طرف فطرت کا حسن ہے تو دوسری طرف انسان اور انسانیت کی تباہ کاریاں۔

پہلی رباعی میں سیماب دنیا کے اس انقلابی دور پر طنز کرتے ہیں جس میں انسان تعمیر وترقی کی منزلوں کی طرف بڑھنے کے بجائے تباہی اور فنا کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ خصوصاً مغربی زندگی میں انسانی زوال کا یہ عالم ہے کہ مغرب کی ہوا کے ہر جھونکے میں صرف جلتی ہوئی لاشوں کی بدبو محسوس ہوتی ہے۔

دوسری رباعی میں لندن اور پیرس کی پرکیف اور حسین زندگی کے تناظر میں زوال آمادہ یورپ کی عصری زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسری رباعی میں دنیا کی منتشر اور تباہ ہوتی زندگی، انسانوں کی دارو گیر کی صورت حال نمایاں ہوئی ہے۔

انسانی تباہی کی سب سے خوفناک تاریخ ہٹلر نے لکھی۔ نسلی بنیادوں پر اس نے نہ صرف غیر جرمن پر ظلم وستم کیا بلکہ یہودیوں کی ایک بڑی آبادی کو اس نے گیس چیمبر میں ڈال کر ہلاک کروایا۔ ہٹلر کے اس عمل سے دنیا پریشان ہو اٹھی اور حساس طبقتیں اس غیر انسانی فعل کو برداشت نہیں کرسکیں۔ اس کی خودسری نے ساری دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔

سیماب ہٹلر کی شفا کی کے پس منظر میں انسانی قدروں کو ترقی دینے کی بات کرتے ہیں تا کہ آئندہ ہٹلر جیسی شخصیت پیدا نہ ہو سکے۔

تہذیب وسکوں کا ہو وہ منظر پیدا　　انساں دل انساں میں کرے گھر پیدا
کردو انسانیت کو اس درجہ بلند　　پھر ہو نہ سکے جہاں میں ہٹلر پیدا

سیماب اپنے مخاطبین سے محبت، یگانگت، ہمدردی، غمخواری اور تہذیب وسکون کی وہ فضا قائم کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے لئے دنیا کی ہر شئے سے زیادہ عزیز ہو جائے۔

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ سیماب اکبر آبادی نے دوسری عالمی جنگ کے بہت سے واقعات کو ان کے تاریخی حوالوں کے ساتھ اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے۔

۲۸/اکتوبر ۱۹۴۰ء کو اٹلی کے حکمراں مسولینی نے یونان پر حملہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہ جنگ بہت آسانی سے ہفتے عشرے میں جیت لے گا۔ کیونکہ البانیہ پر وہ پہلے ہی قابض ہو چکا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ یونانی فوج کے عزم وارادے بلند ہیں اور وہ اس سے سخت مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی تو اس کے بالکل برعکس تھا۔ یونان نے اٹلی کو ایک ہفتے میں البانیہ تک واپس ڈھکیل دیا۔ اور پھر اٹلی کی فوج تین ماہ تک خود اپنی بقا کے

لئے لڑتی رہی۔

سیماب نے یونانیوں کی بہادری اور حوصلہ کی ستائش کرتے ہوئے ایک رباعی میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔

یونانیوں میں بلا کا جوہر نکلا　　ہر شخص اپنی جگہ دلاور نکلا
اٹلی کو نہ راستہ ملا بڑھنے کو　　یونان مگر سدِّ سکندر نکلا

اسی طرح ایک دوسرے واقعہ کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔ جب یوگوسلاویہ نے جرمنی کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کردیا تو اس سے متاثر ہوکر سیماب نے ہٹلر جیسے انانیت پرست اور خودسر شخص کی شکست پر خوشی کا اظہار کیا اور یوگوسلاویہ کے اس عزم کو مغرب کے محکوم ممالک کو اپنی آزادی وخودمختاری کے لئے جرأت مندانہ قدم قرار دیا۔ یہ بات درجہ ذیل رباعی کے متن کے داخل میں پوشیدہ ہے۔

اب اور فضا ہے مغربی محشر کی　　مٹتی جاتی ہے خودسری خودسر کی
کی یوگوسلاویہ نے طاعت نہ قبول　　پہلی یہ شکست فاش ہے ہٹلر کی

عالمی جنگ کے زمانے میں سیماب اکبرآبادی کی نظر محض جنگ کے حالات پر ہی مرکوز نہیں تھی بلکہ ان کی ہمہ گیر نگاہ حالات کے دیگر پہلوؤں پر بھی رہتی تھی۔ اس زوال آمادہ دور میں انھیں سیاست، مذہب، سب مجہول دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں مغرب کے حکمرانوں کی دورنگی کا بھی ادراک ہے جو ظاہرداری کے لئے امن اور صلح کی باتیں کرتے ہیں مگر واقعتاً وہ جنگ کے حامی اور غاصب ذہنیت کے حامل ہیں۔ ان کا مذہب جو بظاہر انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کو منظّم کرتا ہے۔ اس فساد وانتشار کے عہد میں وہ بھی بے معنی ہو چکا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو سیماب اکبرآبادی نے ایک رباعی میں پیش کردیا ہے۔

یہ دور فنا زدہ گراں ہے سب پر　　یکساں ہے اثر سیاست و مذہب پر
گونجی ہوئی جنگ کی ہوا ہے سر میں　　اور صلح کا نام کھیلتا ہے لب پر

ان کے نزدیک سائنس کی غیر متوازن اور انسانیت سے مبرا ترقی ہی عصری جنگ اور مذہب کی بے معنویت کا بھی سبب ہے۔ ذیل کی رباعی میں سیماب نے مغرب کی مذہبی زندگی اور اس دور کی ذہنیت کو یوں نظم کیا ہے۔

سائنس کا ہر اصول مرغوب ہے آج　　ذکر مذہب حدیث معیوب ہے آج
پرشور تھا مغرب میں کلیسا کا جرس　　وہ بھی طبل جنگ سے مغلوب ہے آج

دوسری جنگ عظیم میں ایک محاذ پر اٹلی، جرمن اور اس کے ہمنوا ممالک تھے تو دوسرے محاذ پر فرانس، برطانیہ، روس اور اس کے حوارئین تھے۔ اٹلی اور جرمنی کے قافلے میں جاپان نظریاتی طور پر شامل ہونے والا آخری ملک تھا۔ اٹلی، جرمنی اور جاپان کے اتحاد سے بننے والا گروہ Axis Group کہلاتا تھا۔ ہٹلر کی پالیسی سے جاپان کے نظریاتی الحاق کو سیماب اکبرآبادی نے شیر اور لومڑی کی دوستی سے تعبیر کیا ہے جس میں ہمیشہ نقصان لومڑی کو ہی ہوتا ہے۔

جس قوم پہ وقت ابتلا آتا ہے　　اس قوم پر ادبار ہی منڈلاتا ہے
ہے لومڑی شیر کی اُلش پر نازاں　　جاپان بھی جرمن سے ملا جاتا ہے

سیماب نے جنگ کے تصور سے پیدا ہونے والے احساسات اور مختلف کیفیات کو اپنی رباعی میں پیش کیا ہے۔ اس جنگ سے جغرافیائی اعتبار سے محض کچھ انسانوں کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا وجود خطرے میں نظر آرہا تھا۔ جنگ کا خوف لوگوں کے اعصاب پر اس طرح سوار تھا کہ خلوت و خواب میں بھی جنگ کے مناظر ہی دکھائی دیتے تھے۔ سیماب نے اس

سیاق وسباق میں جو رباعیات پیش کی ہیں ان میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں جن سے جنگ کی مختلف صورتوں کا ادراک ہوتا ہے۔

ایک شورش بے پناہ آتی ہے نظر　　دنیائے سکوں تباہ آتی ہے نظر
یوں جنگ تصورات پر طاری ہے　　خلوت میں بھی رزم گاہ آتی ہے نظر

یہ جنگ ہے نیستی کا حلیہ خالی　　کر دے گی جہاں کا گوشا خالی
انسان کرے گا پھر حکومت کس پر؟　　انسان سے ہوگئی جو دنیا خالی

جاری وہی چنگیز مآبی ہے ہنوز　　موجود فضا میں شعلہ تابی ہے ہنوز
آتی نہ کمی جذبہ خونریزی میں　　اے خاک تیرا رنگ گلابی ہے ہنوز

سیماب اکبرآبادی کی رباعیات میں خاصا بڑا حصہ ایسی رباعیوں کا ہے جن میں عالمی سیاست کے مختلف ابواب وا ہوتے ہیں۔ جرمنی، روس، جاپان، برطانیہ، چین، فرانس کی باہمی آویزشوں پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ سیماب کی ایسی رباعیاں نیم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

در پردہ فریب اس کے آہنگ میں ہے　　نیکی کا مظاہرہ نئے رنگ میں ہے
کیا صلح میں کامیاب ہوگا جاپان　　مصروف ابھی چین سے خود جنگ میں ہے

ہٹلر نے جو روس سے نئی ٹھانی ہے　　اس طرز عمل سے سب کو حیرانی ہے
باطن کو تو دانائے حقیقت سمجھے　　ظاہر میں یہ اک صاف نادانی ہے

حاصل جرمن کا مدعا ہوجاتا　　اب تک تو کبھی کا فیصلہ ہوجاتا
برطانیہ روس کو نہ دیتی جو مدد　　بے شک رشیا کا خاتمہ ہوجاتا

مغرب میں جنگ اور انتشار کی صورتِ حال کے لئے سیماب مغرب کی مادہ پرست تہذیب کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ مادی ترقی نے انسان کے عیش و آرام کے لئے بہت سے وسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ چنانچہ انسان کا انحصار آہستہ آہستہ مصنوعی چیزوں پر بڑھتا گیا۔ اس کا منفی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی میں محبت تعلقات اور جذبے کی اہمیت کم سے کمتر ہوتی چلی گئی۔ ایسے معاشرے میں مکر و فریب، خود غرضی بھی پیدا ہو جاتی ہے جو ہر لمحہ اپنے فائدے کے لئے دوسرے انسانوں کو تہہ تیغ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ سیماب اکبر آبادی اسی لئے مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہیں کہ اس نے تعمیر و ترقی کے مفہوم کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ مثلاً۔

تہذیب نوی نے آگ پھیلا دی ہے　　مغرب کے لئے نوید بربادی ہے
بستی کو اجاڑ کر بنانا صحرا　　اس دور کی یہ بھی عالم ایجادی ہے

تیسرے اور چوتھے مصرعے سے سیماب کا نئی مغربی تہذیب پر طنز ظاہر ہے۔ ایک دوسری رباعی میں وہ یورپی زندگی کے غیر جذباتی پہلو کو بہت صاف صاف نظم کرتے ہیں۔

یورپ میں سکون و صلح کا رنگ نہیں　　جذبات محبت سے ہم آہنگ نہیں
فطرت کا نظام توڑنے والوں سے　　فطرت کا یہ انتقام ہے، جنگ نہیں

مذکورہ رباعی کے آخری شعر میں سیماب نے فطرت کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ قابل قدر ہے۔ غیر جذباتی زندگی کا فروغ مادہ پرست انسانوں نے کیا جو فطرت کے نظام کے یقیناً خلاف ہے۔ اس لئے انسان ہی نہیں ہر جاندار میں فطرت نے محبت، ہمدردی اور

یگانگت کا جذبہ رکھا ہے۔ فطرت ایک حد تک اپنے نظام کے توڑنے والوں سے درگزر کرتی ہے۔ مگر جب صورتِ حال انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ خود اپنا انتقام لیتی ہے۔ فطرت کے متعلق یہ باتیں وہ سائنس داں بھی کہتے ہیں جو ماحولیات اور فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جنگ اور تخریب کی تصویروں سے سیماب کی حساس طبیعت جب پریشان ہو جاتی ہے اور جب وہ موجودہ صورتِ حال کو یکساں قائم دیکھتے ہیں تو فطرت اور خدا سے استفہام کے لہجے میں ایسے انقلاب کی گزارش کرتے ہیں جو اس منظر نامے کو تبدیل کر دے۔ اور کبھی دوسروں کو بھی اس تصور سے تسکین قلب پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کب سطوتِ باطلہ کو زک پہنچے گی؟ کب قہر الٰہی کی کسک پہنچے گی
کیا ظلمتِ بیداد میں ہوگی نہ کمی کیا رات یہ صبح حشر تک پہنچے گی

فطرت پہ نظر خاطر آزاد رہے اس کا بھی خیال اے ستم ایجاد رہے
طوفاں کی گرج کو قولِ فیصل نہ سمجھ فطرت ابھی خاموش ہے یہ یاد رہے

پرشور رہے گی بربریت کب تک؟ انسان کو پہنچے گی اذیت کب تک
شورش کدۂ دہر میں ہے حشر بپا خاموش یوں ہی رہے گی فطرت کب تک

آخری رباعی میں سیماب فطرت کی خاموشی پر جہاں سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں وہیں اس سوال میں اس کا اثبات بھی ہے کہ فطرت زیادہ عرصہ تک خاموش نہیں رہتی وہ خود کریہہ صورت کا علاج کر دیتی ہے۔

سیماب اکبرآبادی کی نگاہ عمیق صرف ملکی سیاست کی طرف مرکوز نہیں تھی بلکہ انھوں

نے اپنی رباعیوں میں قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو بھی پیش کیا ہے کہ جب تک قوم پرست ملکی عوام کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ ہے تب تک کسی بھی قوم کا وجود دنیا سے نہیں مٹ سکتا۔ اور وہ قوم مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکتی۔ اس ضمن میں ان کی تین رباعیاں ملاحظہ ہو۔

دبنے سے دبانے سے نہیں مٹ سکتی　　یا خون بہانے سے نہیں مٹ سکتی
جس قوم کو احساس ہو قومیت کا　　وہ قوم مٹانے سے نہیں مٹ سکتی

مرنا جینا، ہو ملک و ملت کے لئے　　لازم ہے یہ وصف آدمیت کے لئے
ان سب پہ میرا سلام پہنچے تا حشر　　جو لوگ فنا ہوئے محبت کے لئے

اب جنگ میں بیکار ہیں تیر اور تلوار　　ہے جذبۂ قومی ہی بڑا اک ہتھیار
جس قوم میں قومیت کا احساس نہیں　　اس قوم کا غلبہ ہے یقیناً دشوار

مذکورہ بالا رباعیات میں سیماب نے قومیت کے احساس کو اجاگر کر کے قوم کے اندر حب الوطنی کے جذبہ کو بیدار کیا ہے۔ یعنی اگر مرنا اور جینا ہو تو ملک وملت کے لئے ہونا چاہئے۔ جو لوگ اپنے ملک وملت کے لئے فنا ہوتے ہیں یا ہوئے ہیں ان پر سلام ہو۔ دراصل وہی اپنے وطن کے سرپرست اور قوم و وطن کے سچے رہبر ہیں۔ ان کے دلوں میں قومیت اور وطنیت کا پاس ہے اور یہ جذبۂ قومیت ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ہندوستان کی عظمت و بلندی اس بات میں مضمر ہے کہ کرشن اور گوتم نے حیات ابدی بھی یہیں پائی ہے اور اس کی یہی عظمت انگلینڈ، اشیا کے دل میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

انگلینڈ وفا کیش اسے کہتا ہے　　رشیا بھی خوش اندیش اسے کہتا ہے
عظمت ہے میرے وطن کی سب کے دل میں　　جاپان گرودیش اسے کہتا ہے

یہ ہند جو ایشیا کی جنت ہے　　انوار بدوش مشرق عظمت ہے
ہر شام اک اندیشہ فردا ہے یہاں　　ہر صبح اک انقلاب کی دعوت ہے

ایشیا میں سب سے مقدس سرزمین ہندوستان ہے اور یہ ایشیا کی جنت ہے۔ چونکہ یہاں کی ہر شام ایک نئے آنے والے دن کے لئے نئی سوچ وفکر کا پیغام دیتی ہے اور مشرق کی سمت سے ہر روز نور کا اجالا ہوتا ہے اسی لئے ہمارے وطن کی ایشیا میں بہت عظمت ہے۔

سیماب نے قومیت و وطنیت کے جذبے کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف وانتشار کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے ایسے افراد کی ذہنیت پر طنز کیا ہے جو فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں اور مشکل وقت میں قوم کی بہتری کے متعلق غور وفکر کرنے کے بجائے فرقہ واریت کا زہر پھیلاتے ہیں۔ اور اپنے ہم وطنوں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ جن افراد کو اپنے ہمسایوں کے خون کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی ہے اور جن کو وطنی محبت کا ذرا سا بھی پاس ولحاظ نہیں ہوتا ہے وہ اپنے وطن کو کیا بچا سکتے ہیں۔ سیماب کہتے ہیں کہ اگر یہی صورتِ حال برقرار رہی تو ہندوستان میں بھی زبردست خونریزی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ مثلاً ؎

لائے تو سہی رنگ، دورنگی ہی سہی　　میداں نہ سہی دلوں کی تنگی ہی سہی
آثار ہیں ہند میں بھی خون ریزی کے　　کچھ اور نہیں تو خانہ جنگی ہی سہی

غرض سیماب کے مجموعہ رباعیات ''عالم آشوب'' میں اس دور کے عالمی سیاسی منظر نامے ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات اور دوسری جنگ عظیم کے نتائج واثرات سے متعلق بہت عمدہ رباعیاں لکھی ہیں۔ ان رباعیوں کا اردو ادب میں ایک اہم مقام ہے۔ معاصرین سیماب نے جہاں رباعیوں کے موضوعات کے فلسفے، سماج پر طنز اور پند ونصائح تک محدود

رکھا وہیں سیماب نے اسے اختراعی مزاج دے کر اس میں ایک اور زندگی کے تمام موضوعات کوسمویا ہے اس لئے ہر لحاظ سے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ رباعیاں وقتی اور ہنگامی موضوع اور سپاٹ پن کے سبب دلفریبی، ادبی لطافت و چاشنی سے محروم ہیں۔ اس کے باوجود اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔۔

''سرودِ غم'' اور ''نفیرِ غم''

سیماب کے منظوم کلام کا ایک اہم اور قابل ذکر حصہ ان کی عزائی شاعری پر مشتمل دو مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ ان کے نام ''سرودِ غم'' اور ''نفیرِ غم'' ہیں جو ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آئے۔ یہ مجموعے سیماب کی انسان دوستی، مذہب پسندی، فرقہ وارانہ اور مسلکی بے تعصبی، مظلوم سے ہمدردی اور اعلیٰ و ارفع انسانی اقدار کے فروغ کی کوششوں کے مظہر اور فنی و اسلوبی خوبیوں کا نمونہ ہیں۔ سیماب نے اپنے نظمیہ مجموعوں نے ستاں، کارِ امروز اور ساز و آہنگ کی نظموں کے کثیر الجہت اور رنگا رنگ موضوعات کے علاوہ ان دو مجموعوں میں مخصوص، عظیم اور مقدس موضوع یعنی واقعۂ کربلا اور عظمت امام حسین پر اپنا پُر زور و پُر جوش کلام پیش کیا ہے۔ ان مجموعوں کے مندرجات سے سیماب کے حضرت امام حسین اور تمام حضرات اہل بیت سے قلبی تعلق اور عقیدت و محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان میں انھوں نے عزائی شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور رباعیوں پر مشتمل ان مجموعوں کا سلسلہ نظم جدید کے آغاز سے ہوتا ہوا اپنے ماضی کی طرف پہنچ کر میر انیس و مرزا دبیر تک جا ملتا ہے جنھوں نے مذکورہ اصناف شعری کو اپنے عہد کی لاجواب اور قابل قدر اصناف کا درجہ عطا کیا تھا۔

مرثیے کی روایت دنیا کی کم و بیش تمام زبانوں میں موجود ہے؛ لیکن فارسی اور اردو زبانوں میں اس سے ایک خاص قسم کی شاعری مراد لی جاتی ہے۔ اردو میں بطور خاص مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں واقعات کربلا کے تحت حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا کی

یزیدی فوج سے جنگ اور بالآخر شہادت اوران کے درد وغم کے احوال بیان کیے جاتے ہیں، لیکن اردو میں شخصی مرثیوں کی روایت بھی موجود ہے۔ چنانچہ اردو کے متعدد شعرا نے جن میں حالؔی اور اقبالؔ بھی شامل ہیں شخصی مرثیے مثلاً مرثیہ غالب اور مرثیہ داغ وغیرہ لکھے اور انھیں شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔

اردو میں مرثیہ نگاری نے ادب کے افق کو بہت بلند اور وسیع کیا اس کے سبب جہاں شاعری میں موضوعات کا اضافہ ہوا، اور فکر میں ترفع پیدا ہوا، وہیں ادب میں فنی وسعت بھی پیدا ہوئی۔ اس میں رزمیہ اور المیہ عناصر کی شمولیت کے ساتھ منظر نگاری اور جذبات نگاری کے نہایت اعلیٰ نمونے داخل ہوئے۔ منظر نگاری مرثیہ کا بہت نمایاں جوہر ہے۔ صبح کے حسین مناظر، دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ، جنگ کا دردناک نظارہ، شام کا المناک منظر، گھوڑے اور تلوار کی جزئیات پر مبنی صفات، حضرت حسینؓ اور ان کے رفقاء کی دلیرانہ شجاعت، ان کی شہادت کی جزئیات، شہادت کے بعد اہل بیت کی کیفیت، یہ اور اس کی طرح کے لاتعداد مناظر کی جزئیات نگاری کے ساتھ تصویر کشی اور دیگر فکری وفنی حسن کی آمیزش نے مرثیے کو ادب عالیہ میں شامل کر دیا ہے۔

دیگر شعری اصناف کی طرح اردو مرثیہ کا آغاز بھی دکن سے ہوا اور وہ ابتدائی وارتقائی مراحل طے کرتا ہوا شمالی ہند میں مسکین، گدا، سکندر، فضلی وغیرہ سے گزر کر سودا تک پہنچا۔ سودا نے اسے محض رونے رلانے تک محدود نہ رکھ کر مسدس کی شکل میں پیش کیا اور ادبی صنف بنایا۔ میر ضمیر نے اس کی ہیئت متعین کرتے ہوئے مرثیہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا۔ چنانچہ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین اس کے ضروری اجزا قرار پائے۔ ان میں تھوڑی بہت تخفیف وتبدیلی کے ساتھ مرثیہ بہت بعد تک اپنے معیار پر قائم رہا۔

میر ضمیر اور میر خلیق کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے واقعتاً اسے باقاعدہ اور مستقل صنف سخن کی حیثیت عطا کی، لیکن مرثیہ کو جن دو اساتذہ نے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا اور اسے شہرت دوام بخشی وہ مذکورہ دونوں بزرگوں کے جانشین اور شاگردان رشید میر انیس اور مرزا دبیر ہیں۔ ان دونوں حضرات کا نام آتے ہی اصل مرثیہ کا تصور ذہن میں آتا ہے، یا مرثیہ کا نام آتے ہی ان دونوں کا خیال ابھرتا ہے۔ مرثیہ کے ساتھ میر انیس و دبیر کی حیثیت لازم وملزوم کی سی ہوگئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اردو ادب کی مختلف اصناف میں نئے نئے تجربات کئے گئے دیگر اصناف ادب کی طرح مرثیے نے بھی نیا رنگ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں سیماب اکبر آبادی نے بھی متعدد مرثیے، سلام اور رباعیاں لکھیں اور مرثیوں کو نئی شکل بھی عطا کی۔ انھوں نے مرثیوں کے توسط سے حضرت امام حسینؓ اور تمام اہل بیت سے بھرپور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے غم حسین میں جذباتی شرکت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ سودا کی طرح سیماب نے بھی مرثیہ کی فنی حیثیت برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ انھوں نے مرثیوں کو محض غم والم کے اظہار اور رونے رلانے کا وسیلہ بنانے کے بجائے حضرت امام حسین کی اتباع کرتے ہوئے اس صنف کے ذریعہ حق پرستی، جرأت، مردانگی اور سرفروشانہ زندگی کے پیغام کو پیش کیا اور حضرت امام کے اوصاف حمیدہ وخصائل پاکیزہ کے بیان سے اصلاح اخلاق کا سبق دیا۔ چنانچہ ''پیغام بزبان شہید'' میں سیماب نے یہ پُرزور وپُرجوش اشعار کہے۔

ہے کوئی جس نے یہ درس حریت ہم سے لیا؟
ہے کوئی جس نے یہ ذوق معرفت ہم سے لیا؟
ہے کوئی جس نے ریاوکبر کی تردید کی؟

ہے کوئی جس نے ہمارے کام کی تجدید کی؟
جادۂ صبر و رضا میں ہم نے کی پیغمبری
ہے کوئی جس نے ہماری کی حقیقی پیروی؟
ہے کوئی اتنا غیور و باحمیت ہے کوئی؟
جیتے جی واپس خدا کو جس نے کردی زندگی
ہے کوئی قاتل کو دی ہو جس نے خود بڑھ کر صلا؟
ہے کوئی جو کٹ گیا لیکن نہ سجدے سے اٹھا؟

سیماب نے اپنے مرثیوں میں حضرت امام حسینؓ کی شخصیت اور ان کے کردار کو بہت نمایاں شکل میں پیش کیا ہے اور ان کی زندگی سے پیغام اخذ کر کے مسلمانوں کو انھیں اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

ایثار و تحمل و قناعت سیکھو
صبر و تسلیم اور شجاعت سیکھو
سیرت سے حسینؓ ابن علیؓ کی لوگو!
جوش اور اولوالعزمی و جرأت سیکھو

ایک اور مقام پر انھوں نے مسلمانوں کو براہ راست مخاطب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تمھارے اندر حسین کے بازوؤں کی قوت ہے تو پھر مخالف سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر تمھارے اندر اتباع حریت کی صفت نہیں پائی جاتی، اور حسینؓ کی خو بو نہیں تو پھر پیروئِ اسلام کے باطل دعوے چہ معنی دارد؟ یا تو حسینؓ کی ہمت و جرأت اختیار کرو اور باطل کے سامنے سینہ سپر ہو جائے یا پھر جھوٹا دعویٰ اسلام چھوڑ دو:

اے مسلماں جب ہے تجھ میں زور بازوئے حسینؓ
پھر مخالف کی تنومندی سے کیوں ڈرتا ہے تو؟
اور اگر تقلید حریت نہیں تیرا شعار!!
پھر یہ باطل دعوئے اسلام کیوں کرتا ہے تو؟

سیماب نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ مسلمانوں کو حوصلہ مندی کا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ مسلمان چونکہ رسول ہاشمی سے تعلق رکھتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ نہایت جری اور بہادر تھے اس لئے ان کی قوم کے افراد کو بھی اس سے وابستہ ہونا چاہئے اور جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ حضرت حسینؓ نے بے کسی اور بے طاقتی کی حالت میں بھی جرأت کا مظاہرہ کیا اور جبر کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ شاعر مسلمانوں سے بھی اسی رویے کا مظاہرہ دیکھنا چاہتا ہے:

حوصلہ رکھو رسولؐ ہاشمی کی قوم ہو!
کام لو غربت میں ہمت سے، جری کی قوم ہو
بے کسی میں جڑ ہلادی جس نے استبداد کی
تم اسی بے کس حسین ابن علی کی قوم ہو

سیماب اکبرآبادی حضرت حسینؓ کی شہادت کو ایک درس کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس میں اہل بصیرت اور اہل فکر کے لئے نصیحت کے پہلو ہیں۔ ان کے نزدیک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی سینہ کوبی اور صرف رونے اور رلانے کے لئے نہیں ہے۔ مسلمان کو غیر ضروری سینہ زنی کے بجائے روزانہ قرآن پاک پڑھ کر حضرت امام کو ثواب پہنچانا چاہئے۔ اس طرح انھوں نے اصلاحی رویہ بھی اختیار کیا ہے اور لوگوں کو صحیح روش اختیار کرنے کی تلقین کی ہے:

رو رو کے داستانِ شہادت نہ کر بیاں　　خاموش نوحہ خواں

برپا عزا کدے میں ہوا شور الاماں　　خاموش نوحہ خواں

دل میں غم حسین علیہ السلام کر　　خوشیاں حرام کر

قرآن پڑھ کے روز تو پہنچا انھیں ثواب　　خاموش نوحہ خواں

سینہ زنی ہے شیوۂ اسلام سے بعید　　ہر گز نہیں سعید

مقبول بارگاہ نہیں سینہ کوبیاں　　خاموش نوحہ خواں

گزشتہ اوراق میں اس بات کا تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے کہ نظم کی ہیئت میں نت نئے تجربات کرنے میں سیماب کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ سیماب کی عزائی شاعری بھی ان ہیئتی تجربات اور اعلیٰ فنی محاسن سے معمور ہے۔ منقولہ بالا اشعار سے ان کے ہیئتی تجربے کی نشاندہی ہوتی ہے جس کی مزید تفصیل زبان اور طرزِ ادا کے زیرِ عنوان پیش کی جائے گی۔ سیماب کا کہنا ہے کہ عرصۂ دراز سے اسلام پر جمود طاری ہے اور مسلمانوں کی حالت پریشان کن ہے۔ ان غم انگیز حالات کے پس منظر میں شاعر کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر کوئی حسینؓ کیوں نہیں پیدا ہوتا؟

وہ جو کہتے ہیں شہادت ہر زمانے میں ہے عام
''جذبۂ صادق'' سے ہوسکتا ہے اس کا انصرام
پوچھتا ہوں اُن سے تیرہ سو برس سے آج تک
کیوں نہ انسان نے لیا اس جذبۂ صادق سے کام
کیوں خدا کی راہ میں دیتے نہیں یہ اپنی جاں
آج بھی لاکھوں مجاہد ہیں کروڑوں ہیں امام

روح ہے اسلام کی ، مدت سے مرجھائی ہوئی
جوش میں آتا نہیں کیوں ان کا خون لالہ فام
ہر طرف اسلام پر طاری ہے اک گونہ جمود
سرفروشانہ یہ کیوں کرتے نہیں کچھ انتظام

ان سوالوں کے بعد پھر شاعر خود ہی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

سب زبانی ہیں یہ باتیں بے حقیقت بے دلیل
منصب ابن علیؓ کا ہو چکا ہے اختتام

شہادت امام حسینؓ کے حوالے سے مسلمانوں میں جو سینہ کوبی اور دیگر غیر ضروری اور غیر متعلق چیزیں شامل ہوگئی تھیں، سیماب نے انھیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا اور ردعمل کے طور پر خود بھی ملامت کے شکار ہوئے۔ مثلاً ماہ محرم کی عزاداریوں اور ماتمی جلسے اور جلوسوں میں جہاں خالص سوگوار ماحول ہوتا ہے، بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں انھیں انحرافات اور رویوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سیماب نے ان کی اصلاح کی کوشش کی ہے تاکہ اس عظیم یادگار کا تقدس و پاکیزگی برقرار رہے:

یہ رنگیلے پیرہن، آنکھیں نشیلی، ہونٹ لال
پان کلّے میں جبیں پر مغربی فیشن کے بال
عورتوں کی بھیڑ مردوں کا ہجوم و اژدھام
یہ محرم کا مہینہ عید کی سی دھوم دھام!
پُرہوس دل، چال آوارہ، نظر بھٹکی ہوئی

یہ فریبِ نفس جھوٹا بانکپن بازار میں
گھر میں فاقہ دعوتِ کام و دہن بازار میں
یہ زیارت کے بہانے یہ نظارے بازیاں
قومیت سازی کے پردے میں زمانہ سازیاں

سطور بالا میں سیماب کے مراثی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عہد کے تقاضوں اور اپنے ذہنی وفکری رویوں اور پختہ اور ترقی یافتہ ادبی وفنی شعور کے تحت انھوں نے اپنے مرثیوں میں جدت پیدا کرنے اور انھیں نیا رنگ وآہنگ عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیماب نے اپنے ان دونوں مجموعوں میں متعدد سلام بھی شامل کئے ہیں۔ دراصل سلام بھی اردو کی ایک صنف سخن ہے جو غزائی شاعری میں شامل ہے۔ اس کی ہیئت غزل کے مماثل ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر الگ الگ مضمون کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح سلام میں بھی یہ نوعیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں غزل کی طرح سلام میں بھی مسلسل واقعات کو قطعات کی شکل میں نظم کیا جاتا ہے۔ سلام کے مضامین شہدائے کربلا کے غم انگیز واقعات سے اخذ کئے جاتے ہیں اور اس میں درد وغم کے مضامین کے پہلو بہ پہلو پند وموعظت، صبر وتوکل، ایثار وقناعت اور مذہب واخلاق کے مضامین بھی شامل کئے جاتے ہیں، لیکن جو چیز اس کو غزل کی صنف سے الگ وممتاز کرتی ہے وہ اس کی تمکنت ووقار اور جزالت ومتانت ہے۔

اردو میں مرثیہ کی طرح سلام کو بھی میر انیس ومرزا دبیر نے ترقی کی بلندیوں تک پہنچایا۔ اس میں انھوں نے اپنے مذہبی معتقدات اور فلسفۂ حیات کو پیش کیا۔ بعد کے بعض شعرا نے بھی اگرچہ اس جانب توجہ کی، لیکن وہ اسے مزید فروغ دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ کام سیماب نے بہت عمدگی سے انجام دیا ہے۔

ان کے مجموعوں ''سرودِ غم'' اور ''نفیرِ غم'' میں بھی سلام شامل ہیں جن کی تعداد چوبیس ہے۔ سیماب کے سلام بھی ان کے مرثیوں کی طرح جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور نئی طرز و انداز کے ہیں۔ انھوں نے بلندیٔ تخیل اور ندرت اسلوب کے سہارے ان میں انفرادیت اور توانائی پیدا کی ہے:

ایک دور سلامی دنیا کا صدیوں میں ایسا آتا ہے
جب کوئی پیمبر اٹھتا ہے یا کوئی شہادت پاتا ہے
جب نوحہ کعبے والوں کا رو رو کر کوئی سناتا ہے
سینہ میں روح لرزتی ہے جینے سے جی گھبراتا ہے
تسلیم و رضا کی منزل میں ہر گام پہ لاکھوں خطرے ہیں
دریا سے آگ ابلتی ہے بادل شعلے برساتا ہے
ہے زندگیٔ جاوید کہاں یہ زندگی اس کو ملتی ہے
جنگل کی تپتی ریتی پر جو اپنا خون بہاتا ہے

نزدیک قیامت آپہونچی کیا صبح شہادت آپہنچی
اے صبح کے تارے کچھ تو بتا کیوں پھیکا پڑتا جاتا ہے

زمین کربلا ہے لالہ خیز و خوں فشاں اب تک
ہیں اک افسانۂ خونیں کی باقی سرخیاں اب تک

وہی ظلم اور مظلومیت سیماب کیا کہئے
کسی کا منتظر ہے، انقلابِ آسماں اب تک

سیماب اکبر آبادی نے اپنے سلاموں میں اہل بیت سے گہری عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور حضرت امام حسینؓ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شہادت کے فلسفے کو بہت بلندی تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ سیماب کے نزدیک حضرت حسینؓ کی شہادت حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی تعبیر ہے۔ حضرت اسماعیلؑ گو ذبح نہیں ہوئے مگر حضرت ابراہیمؑ نے جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا اور حضرت امام حسینؓ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے:

بالیقیں سیمابؔ یہ ذبح عظیم خواب ابراہیمؑ کی تعبیر ہے

اس کے بعد شاعر پورے واقعہ، اس کے محرکات و نتائج کے سلسلے میں مکالماتی و استفہامیہ انداز اختیار کرتا ہے اور تخریب کے ذریعہ تعمیر نو کی بات کرتا ہے۔ اہل کربلا کی دردناک شہادت بظاہر تخریب ہی ہے، لیکن تعمیر نو کے لئے تخریب کی ضرورت پیش آتی ہی ہے۔ اہل کربلا نے اپنی قیمتی جانوں کی قربانی دے کر دنیا کے نئے سرے سے تعمیر کی راہ ہموار کی۔ یہ ایک ایسی مشیّت الٰہی تھی جس کا حقیقی علم اللہ کے پاس ہی ہے۔ شاعر اس کو جاننے کا آرزومند ہے:

تخریب سے جہاں کی تعمیر ہو رہی ہے تیری مشیتوں کا یارب یہ رنگ کیا ہے

حضرت امام حسینؓ کی عظمت کو وہ اس طرح پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

سر کہاں ہوگا اگر دوش نبیؐ پر پاؤں تھے
عظمت کونین پاسنگِ سر شبّیر تھی

واقعۂ شہادت کو وہ فقید المثال کارنامہ سمجھتے ہیں:

تھی شاید کربلا ہی آخری منزل شہادت کی
کہیں دنیا میں اب کیوں سانحہ ایسا نہیں ہوتا

واقعۂ شہادت کربلا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ اس کے نقوش گہرے ہیں۔ اہل کربلا نے اپنی عظیم قربانی کے طفیل خود کو زندہ جاوید بنالیا اور وہ خود شہید ہو کر اسلام کو بھی دائمی زندگی بخش گئے:

شہیدان وفا پابندِ قسمت کے نہیں ہوتے
یہ اپنے حسب مرضی خود بنا لیتے ہیں تقدیریں

حضرت حسین کی شخصیت صبر و رضا، فنا و خود سپردگی، حریت و شجاعت اور ضبط و ایثار نفس کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ انھوں نے روز شہادت اپنی شخصیت کے جوہر دکھائے اور اپنی جان کو رب عظیم کے لئے قربان کر دیا:

راضی برضا جو ہیں ان کی محرومی کیا نومیدی کیا
تسلیم و رضا کے مسلک میں پابند تمنا کوئی نہیں

سیماب کے سلاموں میں منظر نگاری کی بھی عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن جہاں جہاں انھوں نے اس جانب توجہ کی ہے، وہاں اشعار بلند اہمیت کے حامل بن گئے ہیں:

تپتی ریتی جلتی زمیں اور اس پہ شہیدوں کی لاشیں
یہ آگ میں سیج بچھائی ہے، یہ سونا ہے انگاروں میں

صبح عشرہ صبح محشر شام عشرہ شام محشر
میداں میں پڑا ہے سناٹا یا دنیا تھی یا کوئی نہیں

میدان سے خیمے تک لاشیں اور کوئی نہیں رونے والا
آنکھوں سے دامن تک آنسو اور پونچھنے والا کوئی نہیں

سیماب اکبرآبادی کے سلاموں میں بلاغت کے منفرد نمونے متعدد جگہ ملتے ہیں جو ان کے کلام میں حسن پیدا کرتے ہیں:

وحدت کے پرستاروں کی جبیں جھکتی ہے تو پھر اٹھتی ہی نہیں
جن کو ادراک سجدہ ہے وہ ایک ہی سجدہ کرتے ہیں

معصوم و جواں مرنے والے ہوتے ہیں میرے تصور میں
جب چاند گہن میں آتا ہے جب تارے ڈوبا کرتے ہیں

سجاد اسیر جور ہوئے صد حیف کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستون کعبہ ہیں زنجیر کسے پہناتا ہے

دھوکا ہے نشاط و عیش جہاں کس خواب میں الجھا ہے ناداں
دنیا اور دنیا والوں سے اک رات بسے کا ناتا ہے

اے نہرِ فرات! اے نہرِ فرات! افسوس کر اپنی قسمت پر

کوثر کا ساقی آج ترے ساحل سے پیاسا جاتا ہے

غرض سیماب نے اپنی عمومی شاعری سے قطع نظر ''سرودِ غم'' اور ''نفیرِ غم'' کے تحت لکھے ہوئے اپنے مرثیوں اور سلاموں میں بدلتے زمانے کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے حد درجہ ندرت اور انفرادیت پیدا کی ہے۔ انھوں نے تخّیل کی بلندی اور فکر کی ندرت و جدت کے ساتھ ساتھ منظر نگاری، بلاغت، صنائع و بدائع اور دیگر شعری وسائل کے استعمال اور زبان و اسلوب کی تازہ کاری سے اپنی عزائیہ شاعری کو امتیازی درجے پر پہنچا دیا ہے۔ ان جدت و مہارت نے مذکورہ اصناف کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔

بابِ ششم

سیماب کے منظوم تراجم

(الف) وحیٔ منظوم

(ب) الہامِ منظوم

وحی منظوم:

اردو ادب میں ترجمہ نگاری کا فن بہت قدیم ہے۔ ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے ہیں اور ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشو ونما کے لئے بھی ضروری ہے۔ ایک لسانی طبقہ دوسرے لسانی طبقہ سے سماجی رشتہ قائم ہونے پر ایک دوسرے کی بات کو بخوبی سمجھنے کے لئے ترجمے کا سہارا لیتا ہے۔ ترجمہ نگاری وہ شے ہے جس کے ذریعہ نازک سے نازک مفہوم و مطالب کو خوش اسلوبی کے ساتھ دوسری زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔

ایک اعلیٰ درجے کا ترجمہ شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال یا جذبے کا امین اور عکاس ہوتا ہے۔ ترجمے کی زبان نئی اور دلکش ہوتی ہے، نیز ادبی سرمائے میں اضافہ کرتی ہے۔ اس میں قارئین کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ترجمہ نگاری کی اہمیت سے متعلق شہباز حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں اس لئے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پا لیا ہے۔'' [۱]

مترجم کو ترجمے کی زبان کے سرمایہ کو گھنگالنا پڑتا ہے۔ الفاظ کے معنی و مطالب سے سمجھوتہ کرنے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ صوتی آہنگ کے لئے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے۔ اور مناسب لفظوں کی تلاش و جستجو کے بعد ہی صحیح ہیئت یا موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

۱۔ ترجمہ کی اہمیت، شہباز حسین، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، ص ۱۸۸

ترجمے کے سلسلے میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ترجمہ نگار کو جس زبان سے ترجمہ کرنا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے، ان دونوں زبانوں پر اسے عبور حاصل ہونا چاہئے۔ نیز زبان کی ساخت، مزاج اور پس منظر سے بھی اس کی واقفیت ہونی ضروری ہے۔ ترجمہ صرف ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس کی صحیح ترتیب و تاثر کے ساتھ منتقل کرنا ترجمہ نگار کا فرض ہوتا ہے۔

ترجمہ کرنے والے کو لازمی طور سے اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ترجمہ میں الفاظ کا صحیح استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں ترجمہ نگار ناکام ہے تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہوسکتی ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے بہت اہم بات کہی ہے کہ:

> ''خیال کو الفاظ کا جامعہ پہنانے کا عمل ادبی اور تخلیقی نوعیت کا ہے۔ اس لئے دوسری زبانوں سے اردو میں منظوم منتقل کرتے وقت علم بدیع و بیان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور عروض وقوافی، معائب و محاسن سخن اور شعری اسالیب کا عرفان بھی ضروری ہے۔''[۱]

ایک اور جگہ عنوان چشتی منظوم ترجمے کے سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہتے ہیں:

> ''ترجمہ کی زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیال یا انتقال فکر کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی بہت پیچیدہ اور محنت طلب ہوجاتا ہے جس کے لئے تحقیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت

۱۔ منظوم ترجمے کا عمل، عنوان چشتی، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۵۱

کی ضرورت ہے۔'' ۱

ترجمے میں تکنیک اور اسلوب کا کام آرائش نہیں بلکہ مرکزی خیال کی ترسیل یا اظہار کا ہوتا ہے۔ سید مسعود حسین رضوی ادیب نے لکھا ہے:

''کسی خاص خیال کو کسی خاص اثر کے ساتھ ادا کرنے کے لئے دو زبانوں میں ایسے الفاظ ملنا تقریباً محال ہیں جو صوتی کیفیت، معنوی ایتلافی حالت اور تاثیری قوت میں بالکل ایک سے ہوں۔'' ۲

اعلیٰ درجے کے منظوم ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے ہیں۔ اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ وفلسفیانہ خیالات اور جذبے کی شدت کو پوری قوت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے۔ اس میں بنیادی خیال، جذبہ اور فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ زبان تکنیک اور اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی عناصر کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔

کسی بھی زبان کا ادب محض اپنے دائرے میں رہ کر خاطر خواہ وسعت اور بین الاقوامی معیار کا حامل نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے اسے دیگر قومی و بین الاقوامی زبانوں کے ادب سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر استفادہ کرنا، اثر قبول کرنا اور اپنا تاثر ان زبانوں کے ادب پر ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ ترجمہ اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یعنی اپنی

۱۔ منظوم ترجمے کا عمل، عنوان چشتی، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۶۳

۲۔ ہماری شاعری، سید مسعود حسین رضوی ادیب، ص ۷۴

زبان کے ادب پاروں اور شہ پاروں کے ترجمے دوسری زبانوں میں اور دوسری زبانوں کے شاہکاروں کے ترجمے اپنی زبان میں کرنے سے اپنے ادبی سرمایے کی وسعت ومقبولیت میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں دوسری زبانوں کے قارئین ترجمہ کے توسط سے ہمارے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے ادب میں پیش کردہ تمام افکار و خیالات فنی رموز و نکات، شعری و نثری نیرنگیاں ان لوگوں تک بآسانی منتقل ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ہمارے ادب کو مختلف جہتوں سے سمجھنے اور اس کی تحسین کرنے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ادب کا کارواں وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے شاعروں، ادیبوں اور ترجمہ نگاروں نے عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور فرانسیسی شاہکاروں کے تراجم اردو زبان میں کئے جن کی بدولت اردو کے ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ عربی اور فارسی سے جذباتی لگاؤ اور مذہبی عقیدت کے باعث ان زبانوں سے اہلِ اردو کو ہمیشہ تعلق وشغف رہا ہے۔ اور اسی سبب سے قرآن پاک کے متعدد تراجم اردو میں کئے گئے ہیں۔

یوں تو قرآن پاک کے نثری ترجموں کا سلسلہ کافی پہلے شروع ہو چکا تھا لیکن منظوم ترجمہ کرنے کا سلسلہ تیرہویں صدی ہجری سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے کسی بھی شاعر نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلا منظوم ترجمہ سید غضنفر علی، منشی فاضل سونی پت نے کیا تھا۔ انھوں نے صرف پارہ ''الٓمٓ'' یعنی پہلے پارے کا ترجمہ کیا تھا۔ دوسرا منظوم ترجمہ شاہ شمس الدین شائق کا ہے۔ جس کا صرف پہلا ہی پارہ دستیاب ہے۔ تیسرا ترجمہ مطیع الرحمٰن خادم نے ''نظم المعانی'' کے عنوان سے کیا۔ چوتھا، آغا قزلباش نے کیا جس کے صرف تین پارے چھپے ہیں۔ پانچواں ترجمہ مولوی محمد عبداللطیف کا ہے۔ چھٹا

عبدالسلام کا اور ایک ترجمہ فیضی نے کیا تھا۔ وہ بھی شاید مکمل نہ ہوسکا۔ بہر حال ان شعرا کی کوششوں اور کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا سیماب اکبرآبادی نے بھی خیال ظاہر کیا کہ وہ بھی قرآن مجید کا ایک عام فہم، سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ نظم کریں۔ وہ خود کہتے ہیں:

''میں ایک عرصہ سے قران کریم کا منظوم ترجمہ کرنے کے متعلق سوچتا رہا ہوں۔ مسلسل غور وفکر کے بعد اب یہ محسوس کررہا ہوں کہ میرے ارادے میں تائید ایزدی شامل ہے۔ ہفتہ عشرہ میں ابتدائی تیاریاں ہوجائیں تو میں کام شروع کروں گا۔ جب تک ترجمہ مکمل نہ ہوجائے میں کسی بیرونی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا۔ البتہ قصرالادب کی وہ ذمہ داریاں جو مجھ سے وابستہ ہیں بدستور انجام دیتا رہوں گا۔''[۱]

چنانچہ انھوں نے یہ عظیم اور مقدس کام شروع کردیا اور حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے اعلان کے مطابق سات ماہ تک مسلسل کام کرتے رہے اور تکمیل کے بعد ہی سکون سے بیٹھے اور اس طرح ان کی زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ صفحۂ قرطاس پر رقم ہوچکا تھا۔ اور اس یادگار تاریخی ترجمے نے ''وحی منظوم'' کا نام اختیار کرلیا۔

اس نادر ونایاب منظوم ترجمے کے مکمل ہونے کی خبر قصرالادب، آگرہ کے اخبارات وجرائد میں شائع ہوئی تو برصغیر کے گوشے گوشے سے مبارک باد کے خطوط موصول ہونے لگے اور سیماب کے ہم عصر شعراء نے تاریخی قطعات بھی لکھ کر انھیں بھیجے جن میں حامد حسن قادری، کیفی چریاکوٹی، سید علی امیر احسن مارہروی، دل شاہ جہاں پوری، درد کاکوری وغیرہ

۱۔ وحی منظوم، سیماب اکبرآبادی، دیباچہ، ص ۱۰

خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ممتاز علمائے کرام اور معروف ادباء نے بے حد تحسین آمیز کلمات سے سیماب کو نوازا۔ ان کی اس علمی ادبی خدمات اور ''وحی منظوم'' کی تکمیل پر خراج تحسین پیش کیا اور اپنے سپاسنامہ میں سیماب کو ''شاعر اسلام'' کے خطاب سے نوازا۔

سیماب اکبرآبادی نے اپنے منظوم ترجمے پر خود نظر ثانی کی۔ اس کے بعد وہ اپنا یہ مسودہ لے کر مختلف مکاتب فکر کے علماء کی خدمت میں گئے اور اس پر ان کی رائے جاننے کی کوشش کی۔ ان حضرات میں احمد مدنی، مولانا سعید اکبرآبادی مدیر ''برہان''، مولانا حفظ الرحمٰن ندوۃ المصنفین دہلی، مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات نے اس ترجمے کو دیکھا اور مناسب مشورے بھی دیے۔ ترجمہ میں عربی متن سے جہاں ذرا سی بھی عدم مطابقت یا قرآنی مفہوم کے واضح نہ ہونے کا معمولی سا احتمال ظاہر کیا، سیماب نے ان کے مشورے کے مطابق اس کی اصلاح کر لی۔

سیماب نے یہ منظوم ترجمہ ''وحی منظوم'' کے نام سے صرف سات ماہ چھ دن کی قلیل مدت میں مکمل کر لیا۔ انھوں نے یہ ترجمہ بڑی احتیاط و ذمہ داری اور دل جمعی کے ساتھ کیا۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت قرآن کریم کے تمام آداب کا ادب و احترام ملحوظ رکھا۔ ترجمہ کرتے وقت ان کے سامنے مختلف تراجم اور تفاسیر موجود تھیں۔ اس لئے اکثر پورے عرصے وہ باوضو رہے۔ اس کتاب میں انھوں نے متعدد مشاہیر و مستند علماء کرام کی آراء و تصدیقات شامل کی ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''مترجم میں کسی عربی عبارت کو عربی ہی کے اندازِ فہم کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی تو وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب اور اس کے مخصوص طریقۂ تعبیر سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ اور اس بنا

پر قرآن کے مفہوم و مطالب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے
ہوں گے جو اس کی عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔'' [۱]

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس کا ترجمہ زبردست محنت اور غیر معمولی ذمہ داری چاہتا ہے۔ اس کے لئے نہ صرف عربی زبان سے واقفیت شرط ہے بلکہ ترجمہ نگار کے اندر ذوق عربیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔

علامہ سیماب نے ''وحی منظوم'' میں جہاں ترجمے کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ نظر رکھا ہے وہیں ترجمہ کرتے وقت شاعری کے رموز ونکات سے بھی انحراف نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ ترجمہ اس احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کیا ہے کہ کہیں قرآنی متن کے تقاضے نہیں چھوٹیں اور نہ ہی شعریت میں کوئی کمی محسوس ہو۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ انھوں نے پورے تیس پاروں کا ترجمہ ایک ہی بحر میں کیا ہے۔۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ان کے ترجمے کی نوعیت و اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ موصوف نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں (جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)

(یاالٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی
(یاالٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا ان کا رستہ جن پر انعام (وکرم) تیرا ہوا

۱۔ مضمون وحی منظوم کا ادبی ولسانی مرتبہ، عبدالرحمٰن پرویز اصلاحی، مشمولہ ماہنامہ شاعر، بمبئی، شمارہ ۱۹۷۶ء، ص ۴۱

راستہ ان کا نہیں جن پر غضب (کی) ہے (نگاہ) اور نہ ان کا راستہ جو ہوگئے گم کردۂ راہ

سیماب نے ''قرآن پاک'' کا یہ منظوم ترجمہ آسان اور عام فہم زبان میں کیا اور پوری احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے زائد الفاظ کو قوسین میں جگہ دی اور جہاں کہیں ضرورت پڑی تو انھوں نے پورے مصرعے کو قوسین میں درج کیا۔ سورہ احد کا ترجمہ انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

کہدو ہے (میرا) خدا ایک اور خدا ہے بے نیاز ہے نہ زائیدہ نہ زائیدہ (جہاں کا کارساز)

اور نہیں ہے کوئی اس کے جوڑ کا (بے امتیاز)

سورہ ''الھمزہ'' اور سورہ ''الیل'' کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ لفظی بھی رہتا ہے اور حشو وزواید سے پاک بھی ہے۔ سورہ الیل کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)

جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت (مہرباں)

رات کی سوگند جب ہر چیز کو وہ لے چھپا اور قسم دن کی، وہ جب ہو خوب روشن پر ضیا

اور اس کی جس نے مادہ اور نر پیدا کئے ہے تمہاری سعی بے شک مختلف (انداز سے)

(مال) جس نے (راہ مولا میں) دیا (اس سے) ڈرا اور ہے اچھی بات (یعنی دین کو) سچ جاننا

منزل آسان اس کی کردیں گے ہم آسانی کے ساتھ اور جو بے پروا رہا دینے سے روکا جس نے ہاتھ

اور اچھی بات کو جو جھوٹ ہے سمجھے ہوئے کردیں گے سختی میں جانا سہل ہم اس کے لئے

اور اس کا مال اس کے نہ کچھ بھی آئے گا جب جہنم کے گڑھے میں وہ گرایا جائے گا

ہے ہمارا کام بندوں کو دکھانا راستہ ہاتھ میں دنیا و عقبیٰ ہے ہمارا (برملا)

ڈراتے ہیں تمہیں (لوگو) بھڑکتی آگ سے　　صرف وہ بدبخت داخل اس میں ہوگا ٹوٹ کے
روکشی کی جس نے اور جو (حق کو) جھٹلاتا رہا　　متقی جو ہے وہ اس سے دور رکھا جائے گا
مال دیتا ہے کہ حاصل تزکیہ ہو نفس کا　　اور نہیں احساس کسی کا اس پہ جس کا دے صلہ
اس کو تو درکار ہے صرف اپنے ہی رب کی رضا　　جو ہے اعلیٰ عنقریب اس سے وہ خوش ہو جائے گا

سورہ ''ہمزہ'' کا ترجمہ سیماب اس طرح کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں　　جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
ہے خرابی مطعن و ہر عیب جو کی (برملا)　　جس نے مال (وزر) سمیٹا اور گن گن کر رکھا
وہ سمجھتا ہے کہ دے گا مال ساتھ اس کا سدا　　کچھ نہیں وہ 'روندنے والی' میں پھیکا جائے گا
اور تم سمجھے ہو کیا یہ 'روندنے والی' ہے کیا؟　　آگ سلگاتی ہوئی اللہ کی (سوز انتما)
وہ جو ایڑی سے لگی تو دل کی لے لے گی خبر　　بند اس میں کر دیئے جائیں گے وہ (ارباب شر)
(شعلوں کے) لمبے ستونوں میں (بہ ہر سو گھیر کر)

ترجمے کے تعلق سے سیماب بہت محتاط تھے۔ وہ ایک ایک لفظ پر بہت غور و فکر کرتے تھے تاکہ کہیں معمولی سی بھی لغزش نہ آنے پائے۔ مولانا پرواز اصلاحی لکھتے ہیں:

''اردو کے تمام منظوم تراجم میں ادبی محاسن کے لحاظ سے جس قدر یہ ترجمہ اہم ہے اتنا کوئی نہیں کیونکہ اس میں جس قدر لغوی معنی کی رعایت کی گئی ہے اتنی کسی منظوم ترجمے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لئے اردو کے ایسے برمحل الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے کہ ان سے بہتر ملنا دشوار ہے۔ ترجمہ باوجودیکہ خاصا تحت اللفظ ہے مگر اغلاق سے قطعاً پاک

ہے۔قرآن کی مراد کو واضح کرنے کے لئے جابجا قوسین میں اپنی
جانب سے الفاظ بڑھائے گئے ہیں مگر بہت قلیل مقدار میں۔
حالانکہ نظم تو نظم نثر میں بھی مترجمین بالعموم یہی طریقہ اختیار کرتے
ہیں۔ بہت سے مترجم ترجمے کو بامحاورہ کرنے کے لئے آخری
الفاظ کا ترجمہ شروع میں اور پہلے حصے کا ترجمہ آخر میں کرتے
ہیں۔لیکن سیماب صاحب کے ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر
لفظ کا ترجمہ اس کے بالکل مقابل میں دیا گیا ہے۔ اور پھر
بامحاورہ اور عام فہم کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔اس ترجمہ
کو پڑھئے تو اس میں مقدس نغمگی بھی ملتی ہے اور پاکیزہ آہنگ
بھی ملتا ہے جو نہ صرف شریفانہ جذبات کو حرکت میں لاتا ہے بلکہ
وجہ آفرین کیفیت بھی پیدا کرتا ہے۔'' [۱]

اس ترجمہ میں ہر ہر جگہ روانی بے ساختگی پائی جاتی ہے۔اس کا آہنگ اور نغمگی بھی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سیماب کے ذریعے کئے ہوئے چند مزید سورتوں کے ترجمے یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔ملاحظہ ہو:

سورہ ''قریش'' کا ترجمہ سیماب اس طرح کرتے ہیں:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں میں آغاز (بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت (مہرباں)

۱۔ وحی منظوم کا ادبی لسانی مرتبہ،عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی،مشمولہ ماہنامہ شاعر،بمبئی، ۱۹۷۶ء،ص ۴۱

چونکہ ہیں اہل قریش اس بات کے خوں آشنا　　جاڑے گرمی کے سفر سے انس (ان کو ہے بڑا)
چاہئے ان کو، کریں اس گھر کے رب کی بندگی　　جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا (بھر کے جی)
خوف سے (غارت گری کے) پھر اماں بھی ان کو دی

سورۂ ''فیل'' کا ترجمہ سیماب یوں کرتے ہیں:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں

جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

(اے پیغمبر) کیا نہ دیکھا تم نے (غور و فکر سے)　　ہاتھی والوں سے کیا (برتاؤ) کیا اللہ نے
کیا نہیں اس نے غلط سب داؤ ان کے کر دیئے　　اور پرندے جھنڈ کے جھنڈ ان پر بھیجے (غیب سے)

سورۂ ''عصر'' کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)　　جو ہڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
(اے پیغمبر) ہم قسم کھاتے ہیں تم سے عصر کی　　بایقین انسان خسارے میں ہے (سوچو تو سہی)
ہاں مگر، جو لائے ایمان اور عمل اچھے کئے　　اور وصیتِ (دین) حق کی باہمی کرتے رہے
اور جو کرتے رہے تاکید باہم صبر کی　　(وہ خسارے میں نہیں ہیں فائدے میں ہیں وہی)

''وحی منظوم'' کی مندرجہ بالا مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ردیف و قافیہ اور عروض و وزن کے باوجود سیماب اپنے ترجمہ میں مفہوم کی وضاحت و سلاست کے لئے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے سیماب کی زبان دانی، الفاظ پر تصرف اور عربی زبان پر دسترس ظاہر ہوتی ہے۔ سیماب کے منظوم ترجمے کے جو چند نمونے یہاں پیش کئے گئے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس ترجمہ میں کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو کس طرح بہت احسن طریقہ سے نظم کیا گیا ہے۔

ترجمہ نگاری کی ایک اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ ترجمہ شدہ زبان کے الفاظ متن سے حتی الامکان مطابقت رکھتے ہوں۔ اس لئے زبان دانی کی شرط لازم ہوتی ہے۔ ترجمہ نگار کے پاس جب تک ذخیرۂ الفاظ نہ ہو اسے زبان پر مکمل عبور نہ ہو وہ مناسب ترجمہ کرنے کا اہل نہیں کہا جا سکتا۔ کلام پاک کے دیگر منظوم تراجم کا سیماب کے اس ترجمہ سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظوں کی مناسب پیش کش، سلیقہ مندی اور زبان پر عبور سیماب کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ سیماب سے قبل قرآن کریم کے ان منظوم تراجم میں ایسی خصوصیت کا فقدان ملتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے تراجم کی مختلف مثالیں ملاحظہ ہوں جس سے سیماب کے ترجمے کی امتیازی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔

ہے سزاوار خدائے (پاک) ساری خوبیاں　　جو ہے رب سارے جہانوں کا رحیم و مہربان

سیماب

ہے خدا کے لئے ثنا ساری　　سب جہانوں کا ہے وہی والی

مہربان و رحیم ہے جو بڑا　　مالکِ روزِ حشر و روز جزا

غضنفر علی

سب ستائش ہے سزاوار خدا　　جو کہ رب ہے جملہ مخلوقات کا

وہ ہے بخشش کرنے والا مہربان　　مالکِ روزِ جزائے انس و جاں

شائق ایزدی

جملہ خوبی خدا کو ہے شایاں　　کہ ہے پروردگار عالمیاں

کہ بہت رحم و مہر والا ہے　　جس کی رحمت بیاں سے بالا ہے

عبدالسلام سلام

سبھی خوبی سبھی تعریف ہے اللہ کو زیبا　　بزرگی ہے اسی آقائے عالی جاہ کو زیبا

وہ ہے سارے جہانوں کا خدائے برتروبالا　　برابر ساری مخلوقات کا ہے پالنے والا

بہت ہی مہرباں ہے وہ بڑا ہی مہرباں ہے وہ　　سدا رحمت فشاں، رحمت فشاں، رحمت فشاں ہے وہ

کیف بھوپالی

سید غضنفر علی رب کا ترجمہ والی کرتے ہیں۔ یہ لفظ مفہوم کی درست ادائیگی کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح خدا کو مالکِ روز حشر و روزِ جزا ایک ہی مفہوم کی ادائیگی میں کرتے ہیں۔ وزن کو پورا کرنے کے لئے الفاظ کے اضافے شعری اعتبار سے جائز نہیں ہوتے۔

اسی طرح شائق ایزدی نے ''سب کے ساتھ'' ستائش واحد کا استعمال عالمین کے لئے مخلوقات کا لفظ استعمال کیا ہے تو یوم الدین کا ترجمہ ''مالک روزِ جزائے انس و جاں'' کیا ہے۔ ضرورت سے زیادہ لفظوں کا استعمال یا مناسب الفاظ کی ادائیگی اس ترجمے کو کمزور کر دیتی ہے اور نظم کی شعریت جاتی رہتی ہے۔ کیف بھوپالی کا ترجمہ، تشریح و تفسیر زیادہ معلوم ہوتا ہے اور ترجمہ کم۔ جب کہ نظم اپنے اشاراتی اسلوب سے اپنا خمیر تیار کرتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ سیماب کے ترجموں کی یہی خاص بات ہے کہ وہ اپنے اشاراتی اور علامتی اسلوب سے مزین ہوتے ہیں۔ زبان پر عبور انہیں کہیں لفظوں کی ادائیگی کے لئے بھٹکنے نہیں دیتا اور نہایت مناسب ذخیرۂ الفاظ ترجمہ میں معاون بنتا ہے۔ سیماب کے ترجمہ کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے انھوں نے عربی متن پر ارتکاز کرتے ہوئے اسی کے عین مطابق اردو کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور زائد الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ جب کہ کیف بھوپالی کے ترجمے میں زائد الفاظ کی کثرت نے نہ صرف یہ کہ شعریت کو مجروح کیا ہے بلکہ مناسب ترجمہ سے بھی بُعد پیدا ہو گیا ہے۔ اس فرق کا اندازہ بآسانی دونوں شعراء کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)

جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

کیا نہیں کھولا، تمہارا سینہ ہم نے (اے نبی) اور تمہارا بوجھ تم پر سے اتارا (واقعی)

بار سے جس کے تمہاری ٹوٹی جاتی تھی کمر اور تمہارے ذکر کو دیں رفعتیں (ہر ذکر پر)

ساتھ مشکل کے ہے آسانی یقیناً (اے نبی) ساتھ دشواری کے آسانی بھی ہے بے شک (لگی)

جب فراغت ہو (تردد سے) ریاضت تم کرو اور (دل سے) اپنے رب ہی کی طرف راغب رہو

سیماب

تجھے بخشی نہیں کیا وسعتِ قلب وجگر ہم نے بتا کیا کم نہ کر ڈالا ترا بار کمر ہم نے

کمر تری جھکی جاتی تھی اتنا بوجھ تھا تجھ پر زمانے سے نپٹ لینا بڑا دشوار تھا تجھ پر

محمدؐ دیکھ تیری بات کیا اونچی نہ کی ہم نے زمیں سے آسماں تک تجھ کو عظمت بخش دی ہم نے

کوئی مشکل نہیں ایسی کہ جو آساں نہ ہو جائے نہ گھبرائے مصیبت سے کبھی انساں نہ گھبرائے

بڑائی ذکر اس کی، سرفرازی پکار اس کی اسی کا کام کر کے بندگی کر بار بار اس کی

(کیف بھوپالی)

سیماب کے ترجمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر آیت کا ترجمہ ایک مصرع یا اسی ایک شعر میں مکمل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس میں ایک طرح کا نظم مضمون اور الفاظ اور اشعار میں ایک طرح کی تنظیم برقرار رہتی ہے۔ اور ایک توازن کی سی کیفیت ترجمہ میں نمودار ہو جاتی ہے جو نظم کا خاصہ ہے۔ نیز اس احتیاط اور التزام سے ان کی عالمانہ بصیرت کا احساس بھی ہر گام پر ہوتا ہے۔

سیماب کے اس ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت سلاست، روانی اور اختصار و

جامعیت ہے۔ یہ صفات قرآن پاک کے دوسرے تراجم میں موجود نہیں ہے، کہیں فارسی آمیز ترجمہ کی کوشش ہے تو کہیں مناسب الفاظ درج نہیں ہیں۔ کہیں زبان کی غلطیاں ہیں تو کہیں حشو وزوائد موجود، کہیں ترجمہ کے بجائے تشریح وتفسیر ہے تو کہیں وزن اور قافیہ کی تنگی کا احساس۔ مثال کے طور پر یہاں چند اشعار مختلف تراجم سے درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(یا الٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی　　اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی
(سیماب)

ہیں عبادت گزار تیرے ہی　　چاہتے ہیں مدد بھی تجھ سے ہی
(غضنفر علی)

تیری ہی ہم بندگی ہیں کررہے　　اور تجھی سے ہم مدد ہیں مانگتے
تجھ کو ہی کرتے ہیں عبادت ہم　　اور تجھ سے ہی لیں اعانت ہم
(شائق ایزدی)

خداوند تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری　　تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری
(کیف بھوپالی)

(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا　　ان کا رستہ جن پر انعام (وکرم) تیرا ہو
راستہ ان کا نہیں جس پر غضب (کی) ہے نگاہ　　اور نہ ان کا راستہ جو ہوگئے گم کردہ راہ
(سیماب اکبرآبادی)

راہ سیدھی ہمیں خدا بتلا　　راہ ان کی کہ جس پہ فضل کیا
جن پہ غصہ ہوا نہ ان کی راہ　　اور نہ ان کی جو ہوگئے گم راہ

(غضنفر علی)

تو چلا ہم کو براہِ راستی　　راہ ان کی جس پہ بخشش تو نے کی
پر نہ ان کی راہ غضب جن پر ہوا　　اور نہ ان کی جو ہیں گمراہ از ہدیٰ

(شائق ایزدی)

کر ہدایت ہمیں وہ سیدھی راہ　　کہ مراد اس سے ہے کتاب اللہ
راہ ان کی ہمیں ہدایت کر　　تو نے انعام کرلیا جن پر

(عبدالسلام سلامؔ)

خدایا ہم کو سیدھی راہ کی ہردم ہدایت کر　　دکھائے راہ ان کی، کی ہیں تو نے رحمتیں جن پر
نہ ان لوگوں کی ہاں جس پر ہوا غیض وغضب تیرا　　نہ ان کی جو ہوئے گمراہ و کافر اور تجھے چھوڑا

(فیضی)

دکھادے ہم کو سیدھی راہ، سیدھی راہ پہ لے چل　　جنھیں تو نے نوازا ہے انھیں کی راہ پہ لے چل
نہ ان کی راہ پر لے چل خدائی مار ہے جن پر　　تیری پھٹکار ہے جن پر تری دھتکار ہے جن پر
نہ ان کی راہ پر لے چل بھٹک کر رہ گئے ہیں جو　　ملمع کی طرح چمکے، چمک کر رہ گئے ہیں جو

(کیف بھوپالی)

یہاں وہ تمام خامیاں ذہن اور نظر کو کھٹکتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ''براہِ راستی''، محل نظر ہے، گمراہ از ہدیٰ اردو نہیں۔ عبدالسلام صاحب کے یہاں زائد الفاظ، کیف بھوپالی کے یہاں تشریح وتفسیر، غضنفر صاحب کے یہاں سلاست، روانی کے ساتھ ساتھ غیر ضروری اختصار ہے اور فیضی کا ترجمہ دیگر تراجم کی نسبت بہتر ہے۔ البتہ سیماب کا ترجمہ ان تمام اوصاف سے مزین ہے۔ منظوم ترجمہ جن کا تقاضا کرتا ہے ان کے یہاں سلاست، روانی اور

سادگی کے ساتھ ساتھ اختصار و جامعیت ہے، زبان کا بہتر استعمال ہے، عربی مفہوم کی بہترین ادائیگی اردو نظم میں ڈھال دی گئی ہے۔ ردیف و قافیہ کی تنگی کا دور تک احساس نہیں ہوتا۔ اس طرح مجموعی اعتبار سے سیماب کا یہ منظوم ترجمہ اپنے فرائض کی پوری ادائیگی کرتا ہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کا جذبۂ صادق اور ان کا دینی شغف قابلِ تحسین ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ ''وحی منظوم'' اردو میں کیا۔ سیماب نے ترجمہ میں اسلاف کے مستند ترجموں کے تتبع کو لازمی قرار دیا ہے۔ اور کہیں تجدد کی راہ اختیار نہیں کی۔ متن کے بہت قریب رہ کر انھوں نے قرآنی مطلب کو صحت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ''وحی منظوم'' جہاں ایک طرف شعریت و نظمیت کے ساتھ ساتھ عروض و بیان کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے، اور سیماب کی استادانہ پختگی اور فنی مہارت کی مظہر ہے تو دوسری طرف ترجمانی قرآن کی صحت اور علمیت اور راست فکری کی آئینہ دار بھی ہے اور اس لحاظ سے ''وحی منظوم'' اردو ادب کا ایک گراں قدر کارنامہ ہے۔

سیماب اکبرآبادی کے اس منظوم ترجمے کے معیار اور عظمت کا اندازہ ان کے عہد کے عربی اور دینی علوم کے علماء و فضلاء کے ان بیانات اور تصدیق ناموں سے بھی ہوتا ہے جو سیماب نے اس ترجمہ کے ساتھ منسلک کئے ہیں۔ آخر میں ان میں سے چند بیانات کو پیش کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

ان حضرات کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ سیماب کے ترجمے کی اہمیت واضح ہو سکے۔ مولانا حفظ الرحمٰن ''وحی منظوم'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سیماب صاحب کی قدرتِ کلام حسن نظر و انسجام نطافت و سلاستِ زبان، ادائے مفہوم میں لفظی ترجمے کی رعایت کا

التزام، ایسے امور ہیں جن کے پیش نظر اس کو مستند اور لائق اعتماد کہا جا سکتا ہے۔ اور موصوف کی محنت و کاوش قابل تبریک و تحسین ہے۔'' [۱]

مولانا حسین احمد مدنی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے یہ ترجمہ حضرتِ سیماب کا بعض بعض مقامات سے دیکھا ماشاء اللہ نہایت مفید اور کارآمد معلوم ہوتا ہے۔'' [۲]

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ایڈیٹر 'برہان' رقم طراز ہیں:

''خاکسار راقم الحروف نے قرآن مجید کا مفہوم ترجمہ از سیماب صاحب اکبرآبادی تقریباً از اول تا آخر تمام کا تمام دیکھا اور اب میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ فاضل مترجم نے یہ ترجمہ بڑی احتیاط اور کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ کیا..... جابجا قوسین میں جو فقرے اور عبارتیں ہیں وہ سب توضیحی اور تشریحی ہیں جن سے ترجمے کے سمجھنے میں مدد ہی مل سکتی ہے۔ نہ کہ مفہوم قرآن میں کسی قسم کا ردوبدل واقع ہوا ہو۔ ترجمہ پر نظر کرنے کے بعد بعض مقامات پر کوئی لفظ کھٹکا تو میں نے بے تکلف مولانا سے عرض کر دیا اور مونالا نے منظور کر کے وہیں ترمیم و تنسیخ کر دی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ منظوم ترجمہ قرآن اردو میں اپنی نوعیت

۱۔ وحی منظوم، سیماب اکبرآبادی، ص ۵۴

۲۔ ایضاً، ص ۵۴

کا پہلا واحد کارنامہ ہے۔'' [۱]

مولانا عبدالنعیم صدیقی کے الفاظ میں:

''موصوف نے محض خدا کے فضل سے سات ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد قرآں کریم کا توضیحی ترجمہ نہایت شگفتہ بحر اور دلآویز پیرایۂ بیان میں مکمل فرمایا..... میں نے بعض مقامات کا ترجمہ خود دیکھا اور مطمئن ہوں کہ حتی الامکان.....اقوال کو اختیار کیا گیا ہے۔'' [۲]

۱۔ وحی منظوم، سیماب اکبرآبادی، ص ۵۴

۲۔ ایضاً، ص ۵۶

الہام منظوم

قرآن پاک کے ترجمہ ''وحی منظوم'' کے علاوہ سیماب اکبرآبادی نے ترجمہ کے فن میں ایک اور عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مشہور مفکر اور فارسی کے عظیم شاعر مولانا جلال الدین رومی کی معرکہ آرا تخلیق ''مثنوی معنوی'' یا ''مثنوی مولانا روم'' کا منظوم ترجمہ سیماب نے بہت دل جمعی، محنت، توجہ اور بھرپور فنکارانہ مہارت کے ساتھ کیا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اس مثنوی کے متعدد تراجم کئے گئے تھے جن میں درد کاکوروی، مولانا راسخ، مولانا یوسف علی شاہ کے منظوم اور قاضی سجاد حسین کا منثور ترجمہ خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ سیماب نے بھی قرآن پاک، مثنوی مولانا روم اور خطبات عزیزیہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس طرح بحیثیت مترجم بھی اردو شاعری میں سیماب کا اہم مقام ہے۔ فن شعر پر کامل عبور اور فارسی ادبیات و شاعری پر گہری نظر کا ہی نتیجہ تھا کہ موصوف نے کلام پاک کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مثنوی مولانا روم جیسے مشکل اور طویل شہ پارے کا ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ کام انھوں نے مولوی فیروز الدین، مطبع فیروز سنز لاہور کی فرمائش پر کیا تھا۔ مولانا روم کی شاہکار مثنوی جو مثنوی معنوی کے نام سے بھی موسوم ہے، مولانا کی ایسی تصنیف ہے جسے کئی صدیوں سے فارسی زبان وادب ہی میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بھی غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔ شاعری کے میدان میں ایسا زبردست کارنامہ انجام دے کر سیماب نے اس موضوع پر بھی اپنا امتیازی مقام حاصل کرلیا ہے۔ سیماب کی اس کاوش سے متعلق مولانا محی الدین قائد رقم طراز ہیں:

> ''لاہور کے زمانۂ قیام میں سیماب نے ایک ایسا کارعظیم انجام دیا ہے جسے اب تک عہد حاضر کا کوئی شاعر مکمل نہ کرسکا تھا۔ وہ

کارِ عظیم مثنوی مولانا روم کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ سیماب نے
اپنی زندگی میں جہاں اور بہت سے کارِ نمایاں کئے ہیں ان میں
سب سے افضل کارنامہ یہی ہے جسے قیامت تک دنیا فراموش نہ
کر سکے گی۔'' [۱]

اس وقت کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب کی ملاقات سے پہلے بھی مولوی فیروز الدین نے اس ترجمہ کی ضرورت محسوس کی تھی اور اس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے امیر مینائی سے رابطہ کیا۔ موصوف نے اس کام کو بے حد پسند کیا لیکن اپنی عمر کی درازی اور ضعیف اعضاء کے سبب اس عظیم کام کی انجام دہی سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد فیروز الدین مرحوم نے سیماب سے اس کام کی درخواست کی۔ سیماب کا شمار اس عہد کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اس کام کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کیا بلکہ اس خدمت کو بہت احسن طریقہ سے انجام بھی دیا۔ نیز تین سال کی سخت محنت اور جاں فشانی سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اس کا نام ''الہام منظوم'' رکھا۔

علامہ سیماب کی خواہش تھی کہ ''مثنوی معنوی'' کے ترجمے میں فارسی متن جیسی اثر آفرینی قائم ہو۔ اسی خواہش کے تحت انھوں نے بارگاہِ رب العزت میں اس طرح التجا کی:

فی الحقیقت مثنوی کا ترجمہ
ترجمہ ہے وحی اور منظوم کا
گر تیری توفیق ہو جائے رفیق
طے ہو اک پل میں یہ وادیٔ عمیق

۱۔ شاعر، آگرہ، اسکول نمبر، ۱۹۳۷ء، ص ۹۰

آگے چل کر وہ مزید دعا کرتے ہیں:

جو بھی جوہر آئینے کے ہوں عیاں
ان کی طلعت کا بنے یہ ترجمان
مقصد اور مضمون پورا کھول کر
ترجمہ ہو خوش بیانی سے مگر
ہر جگہ مقبول ہو اردو میں بھی
مثنوی مولوی معنوی
کام تھا یہ اک گروہ خاص کا
اور یہاں آسرا اخلاص کا

ترجمہ کی عمدگی سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ سیماب کی دعا کو بارگاہِ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل ہوا۔ انھوں نے با محاورہ سلیس اور دلکش اردو زبان میں فارسی زبان کے مفاہیم کو ادا کیا۔ اس ترجمے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر جگہ فارسی زبان کے مفہوم کو بحسن وخوبی اردو زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مثنوی کے پہلے دفتر سے بالکل ابتدائی اشعار یعنی آغاز مثنوی کا متن اور اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

بشنواز نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تامرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

من بہر جمعیّتے نالاں شدم　　جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من　　وز درونِ من نہ جست اسرار من

(رومؔ)

سن تو کیا کرتی ہے باتیں بانسری　　بس شکایت کر رہی ہے ہجر کی
جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے　　مرد و زن روتے ہیں میرے شور سے
پارہ پارہ کر دے سینہ جب فراق　　تب کہیں ہو شرح درد اشتیاق
جارہا ہو اصل سے جو اپنی دور　　اپنا عہد وصل ڈھونڈے گا ضرور
میں ہر ایک مجلس میں فریادی ہوئی　　غم زدوں اور خوش دلوں کے منہ لگی
سب نے یاری مجھ سے کی حسبِ گماں　　پر نہ ڈھونڈے مجھ میں اسرا نہاں

(سیماب)

سیماب زبان دانی کے لحاظ سے بہت مستند شاعر تھے۔ مثنوی مولانا روم کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے اس میں غزل کی سی نزاکت اور لطافت پیدا کردی ہے۔ ان کے اس ترجمے میں زبان کی سادگی وسلاست، انداز بیان کی خوبی وروانی سب کچھ موجود ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا دینی شغف اور روحانی بصیرت بھی اتنا عمدہ ترجمہ کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔

علامہ سیماب نے ترجمہ ''الہام منظوم'' نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کیا اور الہامی افکار کو اس خوبی سے اردو نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے کہ ان کی اس فنی نادرہ کاری کا اپنا الگ امتیاز قائم ہوگیا۔ اردو میں صحت زبان کے ساتھ ساتھ صحت مفہوم کو واضح طور پر ادا کرنے کی کوشش سیماب نے نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ ''الہام منظوم'' کی اہمیت و

افادیت ادبی لحاظ سے تو ہے ہی ساتھ ہی مذہبی اور تبلیغی نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ ہے۔

سیماب کے منظوم ترجمے پر اظہار خیال کرتے ہوئے محترمہ انجم صبحی نے لکھا ہے کہ:

''مرشد مولانا روم کی مثنوی کو دنیا کے بین الاقوامی ادب میں جو درجہ حاصل ہے وہ اظہر من الشّمس ہے ہمارے واعظ اور مبلغ دوران تقریر مثنوی شریف کے اشعار پڑھا کرتے ہیں..... واعظ اور مبلغ جب مولانا روم کی مثنوی کے اشعار میں پڑھتے ہیں تو وہ خوب جھومتے ہیں۔ حضرت علاّمہ کی دوررس نگاہوں اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے والے دماغ نے یہ محسوس کیا اور پھر انھیں احساسات کے پیش نظر علامہ سیماب مثنوی شریف کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے اور کمال یہ کہ عوام تک مولانا نے اصل کی خصوصیت برقرار رکھنے کے علاوہ اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی اور اس قدر برجستہ اور شستہ ترجمہ پیش کیا کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔''[۱]

فارسی زبان کے تمام مفاہیم کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مثنوی کا ترجمہ سیماب نے بامحاورہ، سلیس اور دلکش اردو زبان میں کیا۔ جس میں مثنوی کی اصل خصوصیت بھی برقرار رہی اور ان کی انفرادیت بھی قائم رہی۔

یوں تو اردو میں مثنوی مولانا روم کے کئی ترجمے کئے گئے ہیں مگر منظوم ترجمہ سے پہلے

۱۔ مولانا سیماب کے ادبی سرمایہ پر ایک نظر، محترمہ انجم صبحی، الوارث سیماب نمبر، ۱۹۴۹، ص ۱۳۱

حضرت درد کاکوری نے کیا۔۱۲۹۳ھ میں محمد یوسف علی شاہ نے ''پیراہن یوسفی'' کے نام سے کیا۔ان کے علاوہ اور بھی انتخابات کے ترجمے ہوئے ہیں۔مثنوی معنوی باوجودیکہ علم کلام کا بہترین نمونہ ہے جہاں اخلاقیات کو حکایات کی شکل میں بیان کیا ہے۔ سیماب نے اپنی ذہانت وفطانت اور عروض وزبان پر قدرت کی وجہ سے اس مشکل پر قابو پانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔اسی لئے سیماب نے لفظی ترجمے میں ایسے الفاظ تلاش کئے ہیں جو فارسی کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ صحت مضمون کے ساتھ ادا کرسکیں مثلاً وہ آگے اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

مرد غرقہ گشتہ جانے می کند　　دست را در ہر گیا ہے می زند
تا کدا میں دست گرد در خطر　　دستِ و پائے می زنداز سر
دوست دارد دوست ایں آشفتگی　　کوششِ بے ہودہ بہ از خفتگی

جب کہ قاضی سجاد حسین نے منثور اور مولانا راسخ نے جو منظوم ترجمہ کئے سیماب کا ترجمہ ان دونوں ترجموں سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

جیسے کوئی ڈوبتا جی چھوڑ کر　　مارتا ہو ہاتھ ہردم گھاس پر
ہاتھ اس خطرے میں کوئی تھام لے　　مارتا ہے دست و پا اس خوف سے
ہے پسند دوست یہ آشفتگی　　کوشش بے کار سونے سے بھلی

سیماب

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ڈوبنے والا جان توڑتا ہے　　ہر تنکے پر ہاتھ مارتا ہے
تا کہ خطرے میں اس کی کوئی دست گری کرے　　سر کے ڈر سے ہاتھ پیر مارتا ہے

اس پریشان حالی کو دوست پسند کرتا ہے　　سونے سے لاحاصل کوشش بہتر ہے

مولانا راسخ نے اسی حصہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

ڈوبنے کی ہے یہ حالت سرسبز　　ڈالتا ہے ہاتھ برگ کاہ پر

تاکہ ہو اس وقت کوئی دستگیر　　جاں ستاں ہے خوفِ دریائے خطیر

ہے پسند یا ریہ آشفتگی　　شغلِ بد سے بھی بری ہے خفتگی

سیماب نے ترجمہ کرتے وقت لفظی ترجمہ کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ مثلاً وہ جانے می کند کا ترجمہ جی چھوڑ کر کرتے ہیں۔ جو کہ مولانا راسخ کے ترجمہ کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے شعر میں دست پائے میں زند کا ترجمہ بامحاورہ دست و پا مارنا کے کیا ہے۔ البتہ کتاب مرقوم میں مولانا راسخ نے اس کا ترجمہ جاستاں ہے۔ خوف دریائے خطیر ہے۔ تیسرے مصرعے میں مولانا راسخ نے کوشش بے ہودہ کو شغلِ بد بتلایا ہے۔ جب کہ سیماب نے اسے کوشش بے کار کہا ہے۔ بہر حال آگے بھی سیماب اور راسخ کے ترجمہ میں کچھ اس طرح کا فرق ملتا ہے۔ مولانا قاضی سجاد اس کا ترجمہ کچھ اس طرح کرتے ہیں: سونے سے لاحاصل کوشش بہتر ہے۔

مثنوی مولانا روم کا ترجمہ ''پیراہن یوسفی'' کے نام سے مولانا یوسف علی شاہ نے کیا ہے۔ ان کے ترجمے کی روانی اور برجستگی اس قدر تھی کہ خود سیماب کو بھی شروع شروع میں ان سے توارد پیدا ہو گیا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا یوسف کا ترجمہ سیماب کے پیش نظر رہا ہوگا اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ذیل میں سیماب کے ذریعہ کئے ہوئے کچھ ترجموں کا مولانا یوسف کے منظوم اور قاضی صاحب کے منثور ترجمے کا موازنہ کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ خاص طور سے اس منظوم ترجمے میں سیماب کی عظمت کا اندازہ لگانا

آسان ہوگا۔ ''الہام منظوم'' کے پہلے دفتر سے درج ذیل مثالیں ملاحظہ ہو:

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مولانا یوسف پیراہن یوسف میں اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے　　مردوزن روتے ہیں نالے سے میرے

اور سیماب اکبرآبادی نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے　　مرد و زن روتے ہیں مرے شور سے

ظاہر ہے اس شعر کا پہلا مصرعہ ہو بہو مولانا یوسف علی شاہ کا ہے۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اسی دفتر سے رومی کے اس شعر۔

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

کا ترجمہ یوسف صاحب نے اس طرح کیا ہے:

پارہ پارہ کردے سینے کو فراق
تب کہوں میں شرح دردِ اشتیاق

سیماب اس کو غالباً توارد کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

پارہ پارہ کردے سینہ جب فراق
تب کہیں ہو شرح دردِ اشتیاق

پھر رومی کے ایک اور شعر۔

من بہر جمعیّت نالاں شدم
جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم

کا ترجمہ مولانا یوسف اس طرح کرتے ہیں:

میں ہر اک مجلس میں جالاں ہوئی

نیک بختوں اور بدوں سے میں ملی

میں ہر اک مجلس میں فریادی ہوئی

غمزدوں اور خوش دلوں کے منہ لگی

سیماب کے یہاں دوسرا مصرعہ بلند ہے جب کہ سیما نے یہاں منہ لگنا کہہ کر بانسری کی رعایت کو بھی ملوظ نظر رکھا ہے۔ اسی لئے ان کا دوسرا مصرعہ زیادہ پُر زور ہو گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں دیکھئے:

آتش ست ایں بانگ نائی ونیست باد

ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

یوسف صاحب اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

آگ ہے آواز نائی، نے نوا　　آگ یہ جس میں نہ ہو وہ ہو فنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیماب صاحب نے یہاں بھی دوسرا مصرعہ پورا یوسف صاحب کا لے لیا ہے۔

آگ ہے آواز نے، کب ہے ہوا　　آگ یہ جس میں نہ ہو وہ ہو فنا

پھر رومی کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہر کہ آواز ہم زبانے شد جدا

بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

مولانا یوسف اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

ہم زباں سے جو ہوا اپنے جدا

لاکھ ساماں رکھے پر ہے بے نوا

سیماب بھی پہلا مصرعہ بالکل وہی پیش کرتے ہیں جو مولانا یوسف نے پیش کیا ہے۔ مثلاً

ہم زباں سے جو ہوا اپنے جدا

صدا نو ہو کر بھی ہے بے نوا

سیماب نے یہاں دوسرے مصرعے میں نوا اور بے نوا کے تضاد سے بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔ بہر حال ترجمہ میں بامحاورہ، سلیس اور دلکش زبان ہے جو ان کے دوسرے دفتروں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ جلد سوم میں ایک جگہ وہ اس طرح ترجمہ کرتے ہیں:

آں یکے اللہ می گفتے تا کہ شریں گرد و از ذکرش لبے

گفت شیطانش خمش ای سخت روئے چند گوئی آخر اے بسیار گو

ایں ہمہ اللہ گفتی اے عتو خود یکے اللہ را لبیک گو [۱]

سیماب اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

رات کو اللہ کہتا تھا کوئی ذکر سے تا ہونٹ پائیں چاشنی

بولا شیطان اس سے اے مردِ خدا کب تک اللہ اللہ بولے جائے گا

اللہ اللہ تو نے اے سرکش کہا اس سے کب لبیک کی آئی صدا

مولانا قاضی سجاد نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

ایک شخص رات کو اللہ اللہ کہتا تھا یہاں تک کہ ذکر سے اس کے ہونٹ میٹھے ہوئے تھے

۱۔ الہام منظوم، سیماب اکبر آبادی، جلد سوم، ص ۲۵

شیطان نے اس سے کہا اے سخت جاں چپ　　اے بت بنے آخر کب تک کہے گا
یہ سب تو غرور سے اللہ اللہ کہتا ہے　　اللہ کی جانب سے ایک بھی لبیک کہا ہے

چوں سلیمان نبی شاہِ انام　　ساخت مسجد راو فارغ شد تمام
ہر صباح او را وظیفہ ایں بُدے　　کامد ہے در مسجدِ اقصیٰ شدے
نوگیا ہے رتبہ بودے اندرو　　پس بگفتے نام و نفع خود بگو
توچہ داروئی و نامت برچہ است　　تو زیاں برکہ ونفعت برکہ است
پس بگفتے ہر گیا ہے فعل و نام　　کہ من آنرا جانم وایں راحمام[1]

جب سلیماں نبی شاہِ انام　　ہوچکے مسجد سے فارغ لاکلام
ہر سحر ان کا یہی دستور تھا　　مسجد اقصیٰ میں آتے برملا
جب نئی اک گھاس اگتی دیکھتے　　اس کا نام و نفع اس سے پوچھتے
تو دوا کس کی ہے تیرا نام　　کس کو نقصان نفع تیرا کس پہ عام
گھاس کرتی فعل و نام اپنا بیان　　اس کی ہوں موت اور میں اس کی ہوں جاں

مولانا قاضی سجاد حسین رومی کی اس حکایت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

جب شاہِ عالم سلیمان نبی نے　　مسجد اقصیٰ بنائی اور بالکل فارغ ہوگئے
ہر صبح کو ان کا یہ معمول تھا　　کہ آتے مسجد اقصیٰ میں جاتے
اس میں نیا بوٹا اگا ہوا دیکھتے　　تو فرماتے اپنا نام اور فائدہ بتا

۱۔　الہام منظوم، سیماب اکبرآبادی، جلد چہارم، ص ۱۳۶

تو کس مرض کی کیا دوا ہے ترا کیا نام ہے — تو کس کے لئے مضر اور کس کے لئے نفع رساں ہے
تو ہر بوٹی کام اور نام بتاتی — کہ میں اس کے لئے جان اور اس کے لئے موت ہوں

ہست مسلماں نخانہ ایں تن ایجواں — ہر صباحے ضیف نو آید در آں
نے غلط گفتم کہ آید دمبدم — ضیف تازہ فکرتِ شادی و غم
میزبان تازہ رو شو اے خلیل — در منبد و منتظر شودر سبیل
ہر چہ آید از جہانِ غیب و ش — دردلت ضیف است اورا دار خوش
ہیں مگو کہ ماند اندر گردنم — کہ ہم اکنواں باز پرّد در عدم [1]

ہے بدن مہماں خانہ اے جواں — روز آتا ہے نیا اک مہماں
روز کیا آتا ہے اس میں دمبدم — مہماں فکر پُرشادی و غم
جوں خلیل اللہ بن تو میزبان — منتظر رہ کر نہ در کو بندہاں
جو خیال آئے جہانِ غیب سے — دل کا وہ مہمان ہے رکھ خوش اسے
یہ نہ کہ بس طوق گردن ہوگیا — وہ کوئی دم میں عدم کو اب الٹائے

(سیماؔب)

اے جوان! یہ جسم مہمان خانہ ہے — ہو صبح کو نیا مہمان دوڑتا آتا ہے
نہیں میں نے غلط کہا، لمحہ بہ لمحہ آتا ہے — خوشی اور رنج کے فکر کا نیا مہماں
اے خلیل! خندہ پیشانی والا میزبان بن — دروازہ بند نہ کر اور راستہ میں منتظر رہ

۱۔ الہام منظوم، سیماب اکبرآبادی، جلد پنجم، ص ۳۹۳

غیب جیسے جہان سے جو آئے — وہ تیرے دل میں مہمان ہے اس کو خوش رکھ
خبردار نہ کہہ کہ یہ میرے گلے کا ہار بن گیا — کیونکہ وہ بھی اب عدم کی جانب پرواز کر جائے گا

ہیں بگو احوال خود را اے ایاز — گرچہ تصویر حکایت شد دراز
ہست احوال تواز کانِ نوی — تو بدیں احوال کے راضی شوی
ہیں حکایت کن ازیں احوالِ خوش — خاک بر احوالِ درس پنج و شش
حالِ باطن گر نمے آید بگفت — حالِ ظاہر گویمت در طاق و جفت
کہ زلطیف یار تلخیہائے مات — گشت ہرجاں خوشتر از قند و نبات
حال ہر زمروزے بددی مانند نے — ہمچو جو اندر روش کش بند نے
شادی ہر روز از نوع دگر — فکرت ہر روز را دیگر اثر [1]

ہاں سنا احوال اپنا اے ایاز — گرچہ صورت ہے حکایت کی دراز
ہیں تیرے حالات ہر دم تازہ تر — کب ہو راضی لو بھلا اس حال پر
ہاں بیاں کر اپنا وہ دل چست حال — کشمکش پر اس جہاں کی خاک ڈال
حال باطن ہو نہیں سکتا بیان — حال ظاہر کچھ سناتا ہوں میں ہاں
باب کی سب تلخیوں کو لطفِ یار — قند سے بڑھ کر بنا دے خوش گوار
کل سے کب ملتا ہے احوال آج کا — جیسے پانی نہر میں آیا ۔ گیا
ہے خوشی ہر روز کی نوع وگیر — اور نیا ہر فکر کا ہے اک اثر

(سیماب)

۱۔ الہام منظوم، سیماب اکبرآبادی، جلد پنجم، ص ۳۹۲

ہاں اے ایاز! اپنے احوال بتا
اگرچہ حکایت کا نقشہ دراز ہوگیا ہے
تیرے احوال، نئی کان کے ہیں
تو ان احوال پر کب راضی ہوتا ہے
ہاں اپنے اچھے احوال بیان کر
پانچ چھ کے سبق کے احوال پر خاک پڑے
باطن کا حال اگر کہنے میں نہیں آسکتا
میں تجھ سے طاق اور جفت میں ظاہر کا حال بیان کرتا ہوں
کیونکہ شکست کی تلخیاں یار کی مہربانی سے
جان کے لئے قند وشکر سے زیادہ اچھی ہوگئی ہیں
ہر روز کا حال کل کی مانند نہیں ہے
جیسے کہ جاری ہونے میں وہ نہر جس پر کوئی بند نہیں ہے
ہر روز کی خوشی ایک دوسری قسم کی ہے
ہر روز کے فکر کا اثر دوسرا ہے

(قاضی سجّاد)

ومی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندۂ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی
ناتوانی پامنہ اندر فراق
ابغض لاشیأ عندی الطلاق

سوئے موسیٰ آئی یہ وحی خدا
کردیا کیوں ہم سے بندے کو جدا
وصل کرنے کے لئے آیا ہے تو
یا جدا کرنے اسے آیا ہے تو
گر ہو ممکن چھوڑ دے راہ فراق
بدترین شے میں سمجھتا ہوں طلاق

(سیماب)

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ پر وحی آئی
تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کردیا
تو ملانے کے لئے آیا ہے
جدا کرنے کے لئے نہیں آیا ہے
جب تک ہو سکے جدائی میں قدم نہ رکھ
اس لئے کہ طلاق میرے نزدیک بری چیزوں میں سے سب سے بری ہے

۱۔ الہام منظوم، سیماب اکبرآبادی، جلد ششم، ص ۲۶۷

سوے جامع مشدے یک شہر یار　　خلق را میزد نقیب و چوبدار
آن یکے را سرشکستی چوب زن　　واں دگر رابردر یدے پیرہن
درمیانہ بیدلی وہ چوب خورد　　بیگنا ہے کہ برد از راہ گرد [1]
(رومؔ)

مسجد جامع چلا اک شہریار　　مارتے جاتے تھے سب کو چوبدار
سرکسی کا توراتے تھے چوب زن　　پھاڑتا کوئی کسی کا پیرہن
ایک بے کس کے پڑیں دس لکڑیاں　　بے گنا تھا بو لے جاتا ہے کہاں
(سیمابؔ)

مندرجہ بالا مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیماب نے ردیف وقافیہ اور عروض کی پابندی کے ساتھ ساتھ اپنے ترجمے میں مفہوم کی وضاحت اور زبان کی سلاست کا بہترین ثبوت دیا ہے۔اس سے سیماب کے منظوم ترجمے کی زبان و بیان، الفاظ پر تصرف اور عربی وفارسی زبان پر مقدور بھر دسترس ظاہر ہوتی ہے۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے لکھا ہے کہ:

''حقیقت بھی یہی ہے کہ ترجمے کا کمال یہ ہے کہ ترجمہ ہونے کے باوجود ترجمہ معلوم نہ ہو اور ترجمہ میں کوئی بات اصل کی چھوٹنے بھی نہ پائے حضرت سیماب کے لئے یقیناً یہ سہولت تھی.....
تاہم انھوں نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور وہ ان کی پرگوئی اور زودگوئی کے لئے بہت بڑی دلیل ہے۔'' [1]

۱۔　ادبی جائزے، غلام مصطفیٰ خاں، الکتاب، آرام باغ روڈ، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۱

سیماب کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ان کے سامنے یوسف صاحب کے منظوم تراجم موجود تھے اور ظاہر بھی ہوتا ہے کہ موصوف نے یوسف صاحب کے تراجم سے استفادہ بھی کیا تھا۔ جس کے سبب بعض جگہ توارد یا مشابہت کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہ بہر حال یقینی بات ہے کہ ترجمہ کے وقت یہ تراجم ان کے پیش نظر تھے۔ لہٰذا سیماب کو بہتر ترجمہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس لئے ان کا جوہر اور زیادہ نکھر کر سامنے آیا۔ وہ خوبیاں یا شاعرانہ حسن جو دیگر تراجم میں مفقود تھیں، سیماب کے ترجمہ کا حصہ بن گئیں۔

اچھے منظوم ترجمے کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ متن کا ترجمہ اپنے اصل سے قریب ہونے کے ساتھ شعریت، تاثیر، ترنم اور نغمگیت سے بھی مزین ہو۔ جس کے لئے شاعر کے اندر زبان اور تخیل کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ شاعر مختلف رعایتوں کا استعمال کرتا ہے۔ لفظوں کا مناسب اور برمحل استعمال، تراکیب میں انوکھا پن اور صوری و معنوی حسن پیدا کرنے کی خاطر صنعتوں کا خیال کرتا ہے۔ سیماب استاد شاعر تھے اور علامہ کی زبان ان تمام خوبیوں سے آراستہ تھی۔ لہٰذا ان کے ترجمے میں بلا کی تاثیر اور خوبصورتی پیدا ہوگئی اور اس خاص شاعرانہ کیفیت کا بھرپور اثر ترجمہ میں نظر آتا ہے جن کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔

کسی بھی متن کے ترجمہ میں اس وقت تک بے ساختگی اور فطری حسن نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ ترجمہ نگار کی ذہنی اور قلبی کیفیت متن یا تخلیق کار کے اس کارنمایاں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ سیماب اکبرآبادی کے یہاں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان میں یہ بھی خوبی تھی کہ وہ فارسی زبان کے تمام اسرار و رموز سے واقف تھے اور تصوف سے بھی ان کو خاص ربط تھا۔ ان کی پوری شخصیت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے اور بلاشبہ ترجمہ کرتے وقت ان کے ذہن

و دل اس عظیم تخلیق میں پوری طرح محو نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منظوم ترجمہ محض ترجمہ نہیں رہ جاتا بلکہ خود ایک شاہکار تخلیق کے روپ میں ڈھل جاتا ہے۔ جس میں بلا کی شعریت، معنویت اور کشش نظر آتی ہے۔ اور یہی باتیں سیماب کے ترجمے کو دیگر تراجم کے مقابلے ممتاز بناتی ہیں۔

سیماب اکبرآبادی ایک بہت ہی باصلاحیت اور کثیر جہتی شاعر تھے۔ زبان و بیان پر انھیں کامل عبور حاصل تھا۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام اور عربی و فارسی کے منظوم اردو تراجم سبھی میدانوں میں انھوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے جس میں انھوں نے گراں قدر جواہر پارے چھوڑے ہیں۔ لیکن اپنے دور کی عام روایت کے مطابق غزل گوئی سے ہی انھوں نے اپنی شاعری کی ابتداء کی اور داغ دہلوی کو اپنا استاد بنایا اور ان سے اصلاح لی۔ جس کے نتیجے میں دبستان داغ کی بہت سی خصوصیات ان کے کلام میں داخل ہوگئیں۔ دبستان دہلی کی غزلیہ روایت کے ساتھ داغ دہلوی کا مخصوص رنگ اور زبان کی شیرینی، گھلاوٹ اور حسبِ ضرورت طنز و شوخی کا انداز انھیں داغ کی شاگردی ہی کا عطیہ ہے۔ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کی غزلیات پر مشتمل سیماب کا کلام ان کے تین مجموعوں ''کلیم عجم''، ''سدرۃ المنتہیٰ'' اور ''لوحِ محفوظ'' میں شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۸۹۸ء سے قبل کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد پورے غزلیہ سرمایے میں تاریخی ترتیب کے سبب موضوع، مواد، فکر، زبان اور طرزِ ادا ہر لحاظ سے ارتقائی شان نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات میں حسن و عشق، فلسفہ و تصوف، سماجی، اخلاقی اور مذہبی مضامین شامل ہیں۔ دیگر کلاسیکی شعراء کے زیرِ اثر لکھی ہوئی سیماب کی غزلیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان تمام غزلوں میں رمزیت و ایمائیت، امیجری، سادگی، شیرینی، سوز و گداز اور تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ موضوع و موقعے کے لحاظ سے چھوٹی اور بڑی بحروں کے مناسب استعمال، غزل کی مخصوص زبان اور انداز بیان غرض ان کے یہاں ہر جگہ حسن نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ موسیقی، نغمگی، ترنم اور بیان و بدیع کی صفات و محاسن کی موجودگی کے سبب ان

کے اشعار کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ سیماب کا ذخیرۂ الفاظ غیر معمولی تھا اور وہ اس کے استعمال کا سلیقہ بھی جانتے تھے۔ وہ صاحبِ زبان تھے یعنی اکبرآباد (آگرہ) کے رہنے والے تھے۔ داغ کے شاگرد تھے اس لئے زبان کی نزاکتوں سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے بہت سے الفاظ کے معنی میں تبدیلی وتوسیع بھی کی بعض اصطلاحیں بھی وضع کیں۔ مثلاً لفظ عشق کے روایتی مفہوم میں اگرچہ اقبال کی طرح، لیکن اس سے بہت کم درجہ میں، تبدیلی کی کوشش کی، اسے نیا مفہوم اور نئے معنی دیئے اور یوں ان کی غزلوں میں عشق کا تقدس اور حسن کی وسعت بہت بڑھ گئی ہے۔ عشق کے مفہوم میں یہ وسعت موضوع کے ساتھ ساتھ الفاظ اور حسن ادا سے بھی ظاہر وآشکار ہوتی ہے۔

ہے حسن ایک جھلک میرے عشق کی تمام
اپنی ہی اک ادا پہ مٹا جارہا ہوں میں

حریم حسن، فردوس محبت، کعبۂ فطرت
خدا جانے وہ کیا کیا ہے جسے میں دل سمجھتا ہوں

ان کی غزلوں میں احساسات و واردات بہت مؤثر ہیں، جذبات میں شدت اور بصیرت میں گہرائی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے دیکھیں تو محاوروں اور جدید تراکیب کے خوبصورت استعمال نے ان کی غزلوں کو بہت شیریں اور لطیف بنا دیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا مؤید ہوں، ایسے الفاظ جس میں غرابت نہ

ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔'' ۱

''میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں۔ غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ مضبوط و لطیف، پُرشوکت ونغمہ بار ہوں اور خیالات وجذبات بلند و پاکیزہ ہوں۔'' ۲

سیماب ایک طرف غزل میں رمزیت وایمائیت اور مؤثر طرزِ اظہار کے حامی ہیں اور رباعی جیسی مختصر ترین صنف سخن میں فنی مہارت کے ساتھ پوری طرح کامیاب رہتے ہیں، تو دوسری طرف نظم جیسی وسیع صنف سخن میں جگہ جگہ اپنی قدرت بیان اور جدت اظہار کا ثبوت دیتے ہیں جس کا سبب ان کا بہترین طرزِ اظہار ہے۔ کامیاب شعری اسلوب کے سلسلے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ جذبات وخیالات یعنی فکر کے مجموعی رنگ سے ہم آہنگ ہو۔ تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ کے سہارے شاعر فکر، الفاظ اور صورت حال کی آمیزش کر کے اس میں تعمیر کی نہیں بلکہ تخلیق کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ عروض و بلاغت کی مروجہ حدوں اور شرطوں پر کلام پورا اترتا ہو۔ سیماب کے یہاں قدم قدم پر فکر و اسلوب کی ہم آہنگی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ہیئت میں نت نئے تجربات کے باوجود ان کی شاعری کی عظمت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی پوری شاعری اپنے اندر ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ زبان میں تراش خراش اور نت نئی تراکیب کے استعمال سے ان کے کلام

۱۔ کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، ص ۱۷۰

۲۔ ایضاً، ص ۸۶

میں زور واثر پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض جگہ معمولی باتوں کو وہ اپنے طرز ادا اور اسلوب بیان سے بہت پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ ان کی شعری زبان کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ:

''ان کے یہاں جمود اور روایت پرستی نظر نہیں آتی۔ یہ ان کے متوازن شعری ذہن کا زبردست کارنامہ ہے۔ انھیں ادبی ورثے کے طور پر ایسی زبان ملی جو صدیوں کے سفر کے بعد صاف ستھری ہو چکی تھی اور جسے ایک معیار بند زبان کا درجہ مل چکا تھا۔ انھوں نے بھی ابتدائی طور پر اسی زبان کو اپنے شعری اظہار کا ذریعہ بنایا جو لغت، املا، بدیع اور بیان کے اصولوں کا بے حد احترام کرتی تھی۔ چونکہ سیماب کا ذہن تخلیقی تھا اس لئے انھوں نے اپنے ذہن کے دروازے نئے ذخیرۂ الفاظ و اسالیب کے لئے کھلے رکھے اور نئے جواہر ریزوں کا خیر مقدم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک طرف شعری زبان کے زندہ عناصر ملتے ہیں اور دوسری طرف نئے الفاظ کا سرمایہ بھی، مگر ایک خاص شعور تخلیق کے ساتھ۔ ان کے الفاظ و تراکیب کا بیشتر سرمایہ غرابت اور ثقالت سے پاک نیز زبان کے تخلیقی حسن کا حامل ہے۔''[۱]

سیماب کی شاعری میں طرزِ ادا اور اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ مضامین کی بلندی

۱۔ بحوالہ سیماب کی نظمیہ شاعری، زرینہ ثانی، ص ۱۲

اور شگفتگی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔اسی طرح خیالات وجذبات کے اظہار میں جو اثر انگیزی اور حسن موجود ہے وہ سیماب کی قادرالکلامی کی عمدہ مثال ہے۔

شام غربت کی درخشانی کا یہ ہے انتظام
بن گیا ہے صبح کا آنسو ستارہ شام کا

وہ تیری خودست آنکھیں، وہ تبسم بادہ ریز
آج تک نظروں میں عالم ہے چھلکتے جام کا

سیماب نے ان اشعار میں فصاحت و بلاغت اور بیان و بدیع کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ اسی طرح اس پوری غزل میں (جس کے دیگر اشعار یہاں پیش نہیں کئے گئے ہیں) جو تراکیب استعمال کی ہیں مثلاً صبح کا آنسو،تبسم بادہ ریز،نقصِ نظارہ، حاصل نظارہ، جلوس حسن، ایوانِ تصور، موجۂ رنگیں، عمر شفق وغیرہ، ان سے انھوں نے اشعار و معنی میں حد درجہ حسن پیدا کر دیا ہے۔

سیماب کی غزلوں میں سادگی و پرکاری اور جدت ادا کے ساتھ اعلیٰ وارفع جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔انھوں نے اپنے اسلوب کی شگفتگی سے شاعری کو نیا آب ورنگ عطا کیا۔ ان کے یہاں فکر وخیال کی بلندی اور فلسفہ کی آمیزش جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔

غزل کے تمام آداب اور تقاضوں کو پوری آب وتاب کے ساتھ برتنے کے علاوہ اپنے مخصوص و پسندیدہ میدان یعنی نظم میں سیماب نے اپنے فکر وفن کے تمام جوہر دکھائے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔اس صنف میں انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔جیسا کہ عرض کیا گیا انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا اور مسلسل

چالیس سال تک وہ غزلیں لکھتے رہے۔اس صنف میں فکری، فنی اور اسلوبی تینوں اعتبار سے انھوں نے اپنے امتیازی کارنامے انجام دیئے۔اس میں تمام موضوعات سموئے اور اسے ہر قسم کے حقائق و معارف پیش کرنے کا وسیلہ بنایا۔غرض اس صنف میں انھوں نے بڑی وسعت پیدا کی جس پر پچھلے اوراق میں گفتگو کی جا چکی ہے۔لیکن ان کے دور کا عام رجحان نظم کا تھا اور جس طرح نوابوں اور بادشاہوں کے زمانے میں قصیدہ شاعر کی شانِ امتیاز سمجھا جاتا تھا، سیماب کے دور میں نظم کا اچھا شاعر بھی معیار کی شناخت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سیماب بھی اس تقاضے سے متفق ہوئے اور انھوں نے نظم پر بھی طبع آزمائی شروع کی۔اس کے بعد سے وہ مسلسل اور متواتر نظمیں لکھتے رہے پھر تو وہ اس صنف کو بہت اہم اور ضروری سمجھنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے خطبات میں لکھا کہ ''نظم، غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنف کلام ہے، میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔'' [۱]

سیماب نے نظم کی گنجائش و وسعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے شمار موضوعات کو نظم کے وسیلے سے پیش کیا۔انھوں نے اپنے خطبات میں شعراء کو شعر کی عظمت کی طرف توجہ دلائی اور شاعر کے منصب کو واضح کیا۔ان کے نزدیک شاعر کا مقصد بہت بلند ہے اور انقلاب اور بیداری لانے میں وہ نہایت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔انھوں نے شعراء کو یہ پیغام دیا کہ:

> ''بحیثیت شاعر قوموں کو ابھارنے، ملک کو بیدار کرنے اور جمود و خمود کے پردے کو چاک کرنے میں اپنی الہامی قوتوں کو بروئے کار لائیں۔'' [۲]

۱۔ خطبات شاعری، کلیم عجم، ص ۱۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۴۶

سیماب کی جوانی کے زمانے میں پوری دنیا، خاص طور سے عالم اسلام میں انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ دنیا کی سیاسی صورتِ حال بالکل غیر یقینی تھی، ترکی، طرابلس، فلسطین، افغانستان اور پہلی جنگ عظیم کے اثرات ونتائج ہر سمجھدار شخص وشاعر کا موضوع گفتگو بنے ہوئے تھے۔ سیماب نے بھی ان موضوعات پر کھل کر نظمیں لکھیں اور قوم کو بیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے علاوہ حب الوطنی، مناظر فطرت کی تصویر کشی، سماجی اصلاح، لوگوں کو انسانی ترفع وعظمت کا احساس دلانے، قوم میں ترقی کی روح پھونکنے اور اعلیٰ وارفع منزلوں کی طرف گامزن کرنے کے جذبے سے انھوں نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ نظم نگاری میں انھوں نے اپنی اجتہادی قوتوں سے کام لے کر جدت وانفرادیت پیدا کی اور اپنے دور کے زندہ احساسات کو نظم میں سمویا۔

انھوں نے زندگی اور سماج کی پیچیدہ حقیقتوں کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈال کر اپنی نظم میں اسے بڑے سادہ طریقے سے پیش کیا۔ مثلاً اپنے وطن ہندوستان کے مزاج اور اس کی روایت سے انھیں گہری محبت تھی۔ وہ اس کی ہر ہر چیز اور ادا کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے وطن خاص کر آگرہ میں تاج محل سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ آگرہ کی تاریخی عمارتوں، جگہوں اور اشخاص سے انھیں جذباتی تعلق تھا۔ اس موضوع پر متعدد نظمیں بڑے والہانہ انداز میں لکھیں۔ اسی طرح اپنے قریب یعنی متھرا میں سری کرشن سے وہ بہت متاثر تھے۔ سادگی، ترنم، نغمگی اور بھرپور جوش کے ساتھ اس موضوع پر متعدد نظمیں لکھیں۔ پورے ملک کے رہنے والوں کو وہ محبت کی ایک ہی لڑی میں پرونا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے وطن کے تعلق سے تمام جذبات واحساسات کو بہت عمدگی کے ساتھ نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظمیں مفکرانہ رجحان، بصیرت افروزی اور سنجیدگی وشائستگی کے لحاظ سے اردو میں منفرد

مقام رکھتی ہیں۔ سیماب کے یہاں تنوع اور جدت ہے۔ وہ زندگی کی وسعتوں اور گہرائیوں کا شعور ہونے کی وجہ سے ایک ہی بات کو بار بار نہیں دہراتے بلکہ اپنی فکر واظہار کے لئے نئے نئے موضوعات کو منتخب کر کے نئی باتیں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں فنی چابکدستی، تخیل کی بلندی اور ندرتِ ادا قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ الفاظ کی ترکیب وترتیب اور اس کے استعمال نے ان کے یہاں ادبی حسن میں اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو تراکیب سے مانوس ومقبول تراکیب کا اضافہ کیا جس سے ان کی شاعری میں نغمگی وترنم میں اضافہ ہوا۔ وہ کسی بھی قسم کی لسانی، شعری اور ادبی گمراہی کو جائز قرار نہیں دیتے تھے۔

سیماب فنِ موسیقی میں بھی گہرا درک رکھتے تھے جو ان کے شعور کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوا۔ نغمگی کے پیکر میں انھوں نے زندگی کے اہم حقائق اور سماج کی اصلاح کا پیغام پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں ''تاروں کا گیت''، ''عزت نفس'' اور ''نوجوان ہندوستان'' بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی، تناسب، توازن اور تسلسل کی مثال میں ان کی نظمیں ''سیاسی قیدی''، ''امن و جنگ''، ''بساطِ سیاست''، ''دعوتِ انقلاب''، ''طوفان کی گرج''، ''تقویم اسلامی کے تین دور''، ''تاج شاہی'' اور ''ہندوستان'' وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں زبان کی تخلیقی قوت وتصرف اور الفاظ کا سیل رواں اُمڈا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ریویو ہندوستان میں ان کے طرزِ ادا پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''سیماب صاحب کی شاعری لطیف زبان اور حسین بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ خوبصورت الفاظ، جمیل تراکیب، چست بندش اور لطیف تشبیہات واستعارات کا بہ یک وقت اجتماع حسن کلام

کے لئے کافی ہے۔ پھر اس کے ساتھ متنوع بحریں، نظم کی نئی نئی شکلیں اور کلام کی روانی میں ترنم اور موسیقی اس حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔'' ۱

مولانا صدرالدین اصلاحی نے لکھا ہے کہ:

''مضامین کی بلندی، الفاظ کی شیرینی، تمام تر صنائع و بدائع کے ساتھ جس دلکش انداز نظم میں مقید کی گئی ہے وہ دریا کو کوزہ میں بھر دیئے جانے کے مترادف ہے۔ یہ سب مولانا مدظلہ کی قدرت کلام، وسعت نظر اور پاکیزگی مذاق کی بڑی کثرت سے شہادت دے رہی ہیں۔'' ۲

سیماب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اردو اور فارسی ادبیات سے گہرا شغف ہونے کی وجہ سے ذخیرۂ الفاظ بہت زبردست تھا۔ موضوع، مواد اور فضا کی مناسبت سے الفاظ و تراکیب کے استعمال میں مہارت تامہ رکھتے تھے جس سے فضا آفرینی اور تاثر انگیزی میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ مثلاً ان کی نظم ''طوفان کی گرج'' میں ہندوستانی سماج میں تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی مغرب زدگی کے قبول کرنے اور ٹوٹتی بکھرتی مشرقی اقدار کا تذکرہ اور اس پر ہماری بے حسی کا انھوں نے اس طرح ماتم کیا ہے۔

اسی جانب بڑھتا آتا ہے سیلاب فنا ساماں　　جہنم در نفس، دشنہ بکف طوفاں درد اماں
وہی رقص و اداکاری وہی نغمات و ساغر وہی بادہ　　وہی شعلہ پرستی رندی و سرمستی پہ آمادہ

۱۔ ریویو ہندوستان، الہ آباد، جنوری ۱۹۲۵ء

۲۔ شاعر، آگرہ، اسکول نمبر، ۱۹۳۷ء، ص ۱۶۷

وہی عشوہ فروشی ہے صنم خانوں کی راہوں میں　　وہی مردہ پرستی ہو رہی ہے خانقاہوں میں

ایک دوسری نظم ''شگفت نظر'' میں سیماب نے زبان وطرزِ ادا کی موزونیت اور حسن سے قاری پر اپنی قدرت بیان کا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

پھر جہاں میں رنگ و بو نشو ونما پانے لگا　　خلد کی آغوش میں صحرا نظر آنے لگا
پھر فروزاں روح تازہ خاک مردہ سے ہوئی　　پیکر افسردگی پھر اور برسانے لگا
پھر بساطِ ارض نیرنگ نمو سے کھل اٹھی　　پھر جمال رنگ و نزہت جلوہ فرمانے لگا

اسی طرح ان کی ایک نظم ہے ''رنگین تیتری''۔ اس کو خوبصورت تشبیہات و استعارات اور محاکات کی مدد سے حسین تر بنا دیا ہے۔ اس میں تخیل کی بلندی اور پیش کش کی نادرہ کاری کو ہم اس سطح پر دیکھ سکتے ہیں۔

دامان گل سے مستی بن کر الجھنے والی　　اوراق گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی
جذبات کی فضا میں اک ذرۂ پریدہ　　رنگوں کے ارتقاء میں اک نقش بریدہ
یا اڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم　　یا مہکا ہوا شعلہ دہکی ہوئی سی مستی

ان اشعار سے محسوس ہوتا ہے کہ سیماب کے یہاں استعارہ کا بکثرت اور برمحل استعمال ہے جس سے نت نئے معنی و مفاہیم روشن ہوتے ہیں۔ منظر نگاری بھی سیماب کی نظموں کی اہم خصوصیت ہے۔ الفاظ کے ذریعہ پوری فضا کی حسین تصویر کھینچنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں شعریت اور شیرینی و لطافت کا بھی حسین امتزاج ملتا ہے۔

تاج محل پر سیماب نے مختلف زاویوں سے نظمیں لکھی ہیں۔ مختلف اوقات میں اس کے نظاروں کا بیان کیا ہے۔ درۃ التاج، تاج کنار شفق میں، صبح تاج، تاج شب تاریک میں

اور چاند اور تاج کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھیں تاج سے دلی اور بے حد محبت تھی۔ ان تمام نظموں میں خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال اور منظر نگاری کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

فنِ تاریخ گوئی میں بھی سیماب کو امتیاز حاصل تھا۔ یہ فن وسعتِ مطالعہ، تاریخ پر نظر، حاضر دماغی، ذہن کی برجستگی اور زبان پر بھرپور قدرت کا ثبوت چاہتا ہے۔ مثلاً کسی کے انتقال کی تاریخ نکالنا، تاریخی نام رکھنا، انتقال کے بعد قبر پر تاریخی کتبہ لگوانا، کسی کتاب یا قصیدے کی تکمیل، کسی ادارے یا اہم عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنا، کسی نواب، بادشاہ، وزیر وغیرہ کے سن جلوس کی تاریخ نکالنا وغیرہ وغیرہ مواقع پر اہل علم کے یہاں تاریخیں یا قطعات تاریخ لکھنے کا رواج رہا ہے۔ اس سے اس واقعہ کی سنہ و تاریخ محفوظ ہو جاتی ہے جس کے لئے یہ قطعہ لکھا تھا یا تاریخ نکالی تھی۔ یہ کمال ہنرمندی سیماب کے حصے میں بدرجۂ اتم آیا تھا۔ انھوں نے مختلف مواقع کے لئے متعدد قطعات تاریخ نظم کئے ہیں جن میں سادگی، سلاست، برجستگی اور روانی و تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت اور زود گوئی کی قوت نے ان سے بہت سے برجستہ اور فی البدیہہ قطعات تاریخ بھی کہلوائے ہیں۔ اور اس میدان میں بھی سیماب کی انفرادیت مسلّم ہے۔

نظموں پر سیماب کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہیئت کے کامیاب تجربے بھی کئے۔ محمد حسین آزاؔد اور حالؔی نے جس نظم کا ڈول ڈالا تھا اور وہ رفتہ رفتہ بہت ترقی یافتہ ہوگئی پورا عہد ایک طرح سے نظم کا عہد بن گیا تھا۔ نظم کے ارتقائی مراحل کے چھبیسویں سال میں عبدالحلیم شرر نے منظوم ڈرامے کی شکل میں نظم معریٰ لکھنے کا پہلا تجربہ کیا تھا۔ اس آغاز کے بعد اس صنف میں مختلف قسم کے تجربات ہوئے جن پر مغربی شاعری کے اثرات واضح طور پر

نظر آتے ہیں۔ اسالیب اور ہیئت دونوں میں یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کہیں سانیٹ کی شکل میں کہیں عروضی ارکان کی ترتیب بدل کر ارکان اور زحافات کی کمی بیشی کے علاوہ مصرعوں اور شعروں کی شکل میں معمولی سا تغیر پیدا کر کے بحروں میں نت نئے تجربے کئے گئے اور نظم کو نیا رخ و آہنگ دیا گیا۔ اس پورے انقلاب کا سہرا جناب سیماب اکبرآبادی کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنی نظم ''عید قرباں'' لکھ کر نظم میں ایک اہم تجربہ کیا تھا۔ یہ نظم معریٰ اور آزاد کی درمیانی کڑی کہی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد قسم کے ہیئتی تجربے کئے۔ کہیں تو کسی نظم میں دو مصرعے پورے اور بقیہ اشعار کے مصرعے اسی بحر کے ارکان کی تخفیف کے ساتھ، کہیں چھوٹی سی بحر کی نظم اس میں چار شعروں کے بعد زندہ باد کا ٹکڑا پھر اضطراب زندہ باد، انقلاب زندہ باد کے مکرر الفاظ سے جوشیلی کیفیت و تاثر پیدا کر کے نظم مکمل کی۔ ایک نظم کی بحر کے ارکان میں اس طرح تبدیلی کی کہ پوری بحر کے بجائے اس کے کچھ ارکان کو آخر میں استعمال کیا گیا ہے۔

نہ ترکی ہیں نہ ایرانی نہ رومی و کیانی ہیں　　کہ ہم ہندوستانی ہیں
ہمارا دیس ہے ہند اور ہم اس کی نشانی ہیں　　کہ ہم ہندوستانی ہیں

اس نظم کا عنوان ہے ''ہم ہندوستانی ہیں''۔ اس کے ہر دوسرے شعر میں بار بار ''کہ ہم ہندوستانی ہیں'' کی تکرار بہت پُر تاثیر معلوم ہوتی ہے۔ سیماب کے ہیئتی تجربوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہیں مکمل بحر کو لے کر کچھ تصرف کے ذریعہ نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ جیسے ''جرس کارواں'' میں ایک ٹکڑا ہے ''یوم آزادی''۔ اس کے ہر بند کے آخر میں ''کہاں ہے یوم آزادی'' مصرعہ کا اضافہ کر کے صوتی ترنم میں مزید حسن پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح کی دوسری نظموں میں ''جاگ اے ہندوستان''، ''اے جوانانِ وطن''، ''کارواں کی

پکار'' اور ''اے اسیرانِ وطن'' وغیرہ شامل ہیں۔ مؤخرالذکر میں چار مصرعے ہم قافیہ یا پھر ان سے علیحدہ اور اس کا تصرف وتبدیل شدہ مصرع اس کا ہم قافیہ ہے۔

چھوٹی بحروں میں اسالیب کی تبدیلیاں بھی سیماب کا امتیاز ہے۔ اس طرح کی نظموں میں بڑا تسلسل، ترنم اور روانی ہے۔ الفاظ کی بندشیں اور ترکیبیں زیروبم کی کیفیت پیدا کردیتی ہیں۔ نظم ''سرگزشت'' کی ابتداء میں دو شعر ہیں اس کے بعد چھوٹی بحروں کے چار مصرعے ہم قافیہ اس کے بعد ایک شعر ہم قافیہ ہے۔ نظم ''شاعر کی تربت'' پوری کی پوری چھوٹی بحر میں ہے اور مسلسل رواں دواں ہے۔ مثلاً

جنگل بیاباں ظلمت بداماں
شاعر کا مدفن اس میں فروزاں
پژمردہ ایک پھول ایک شمع لرزاں
خاموش غزل ماحول ویراں
ٹوٹا سا کتبہ لیکن غزل خواں
پر ہول منظر لیکن نوحہ گر
اللہ اکبر اللہ اکبر

اسی طرح ان کے ہیئتی تجربوں میں بحروں کی تبدیلی، ترکیبوں کا تنوع اور اضافتوں کے التزام کا ایک سلیقہ ملتا ہے، ایک جدت پائی جاتی ہے۔ سیماب کے اندر موسیقی کا ذوق بھی بہت ستھرا تھا۔ انھوں نے ہیئت میں تجربوں کے سلسلے میں بحروں اور اوزان میں جو تصرف کیا ہے اس میں وہ اکثر اس خصوصیت کا لحاظ رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کی ترتیب اور بندشوں کی ترکیب سے ایسا زیروبم پیدا ہوتا ہے جو نظم کی موسیقی اور نغمگی میں حد درجہ اضافہ کردیتا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں ترنم ورعنائیت جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔

یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ انھوں نے اقبال سے بھرپور اثر قبول کیا ہے اور ان کی تقلید میں تجربے بھی کئے ہیں۔ اقبال نے اردو نظم سے زیادہ فارسی غزل اور نظم میں کامیاب تجربے کئے تھے، سیماب نے انہی کی تقلید میں ہیئت کے متعدد تجربے اردو میں کئے ہیں۔ یہاں پہلے اقبال کے فارسی تجربات کے تین نمونے پیش کئے جاتے ہیں پھر سیماب کے اسی طرح کے تجربات کی مثالیں پیش ہیں۔ اقبال کے تجربات کا انداز یہ ہے:

فقر بخشی باشکوہ خسرو پرویز بخش　　یا عطا فرما خرد با فطرت روح الامین

یا چناں کن یا چنیں

(اقبالؔ)

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز　　کاشانۂ ما رفت بتا راج غماں خیز

از نالۂ مرغ چمن از بانگ اذاں خیز　　از گرمیٔ ہنگامہ آتش نفساں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

(اقبالؔ)

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب　　از جفائے دہ خدایاں کشت دہقانان خراب

انقلاب

انقلاب : اے انقلاب

اے مسلمانان فغاں از فتنہ ہائے علم و فن　　اہرمن اندر جہاں ازراں و یزداں دیریاب

انقلاب

انقلاب : اے انقلاب

(اقبالؔ)

اسی ''انقلاب'' والی نظم سے متاثر ہو کر سیماب نے بھی اپنی نظم ''اختلاف'' میں ترکیب الفاظ اور بحر کو مفہوم سے ہم آہنگ کر کے بہت متاثر کن انداز میں اپنی بات پیش کی ہے۔صرف ایک بند پیش ہے۔

ہر سخن پرور ہے اپنی بات پر اٹکا ہوا ہر طرف طوفاں خودداری کا ہے پھیلا ہوا
آج ہر ذہن اک غلط فہمی میں ہے الجھا ہوا ہے مگر کسی کو غلط فہمی کا اپنی اعتراف

اختلاف

اختلاف —— اے اختلاف

اس کے علاوہ سیماب نے نہ جانے کتنے عروضی، ہیئتی اور اسلوبیاتی تجربے کر کے اردو نظم میں جدت وندرت اور تنوع وتازگی کا خزانہ بھر دیا اور پروفیسر عبدالقادر سروری کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

''اسالیب واختراع اور تنوع کی مثالیں جو جدید دور کا حصہ ہیں یہی سیماب کے یہاں نظر آتی ہیں دوسرے شعراء کے پاس کم نظر آئیں گی۔''[۱]

ایسا نہیں ہے کہ سیماب نظم میں تجربات کے میدان میں تنہا و بے نظیر ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس دور میں نظم لکھنے کی سیدھی اور سادہ سی روایت چلی آ رہی تھی، اس کو نیا رخ اور نئی روشنی عطا کرنے میں سیماب اکبر آبادی کا بہت اہم کردار ہے۔ان کی تقلید کر کے بعد کے بہت سے شعراء نے ہیئت کے کامیاب اور عمدہ تجربے کئے اور ان سے بہتر نتائج بھی مرتب کئے۔مثلاً حفیظ جالندھری، عظمت اللہ خاں، ساغر نظامی، حامد اللہ افسر میرٹھی، ن م راشد،

۱۔ جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص ۱۷۲

میراجی، سلام مچھلی شہری، اختر شیرانی، جوش وغیرہ نے اپنے تجربات سے نظم میں نئے امکانات پیدا کئے اور نئی نئی ہیئتوں کا اضافہ ہوا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بعد کی نسل میں علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین وغیرہ نے نظم معریٰ اور آزاد نظم اور بعد کے شعراء نے نثری نظم کے تجربات سے اردو نظم کو مزین کیا اور نت نئے خیالات پیش کرنے کا وسیلہ بنایا۔ ان معروضات سے یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا کہ زبان، طرزِ ادا اور ہیئت میں نت نئے تجربات کے سبب سیماب اکبرآبادی بیسویں صدی کی شاعری میں منفرد و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی قوت اختراع اور زبردست قوت بیان کے سبب اپنے خورد معاصرین، تلامذہ اور مابعد کے شعراء کے فکر و فن اور زبان و طرزِ ادا کے لحاظ سے غیر معمولی طریقے پر اثر انداز ہوئے اور بعد کی نسل نے ان کی پیروی کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

مصنف	نام کتب	مطبع	سن اشاعت
۱۔ سیماب اکبرآبادی	الہامِ منظوم جلد اوّل	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	
۲۔ سیماب اکبرآبادی	الہامِ منظوم جلد دوم	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	
۳۔ سیماب اکبرآبادی	الہامِ منظوم جلد سوم	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	
۴۔ سیماب اکبرآبادی	الہامِ منظوم جلد چہارم	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	
۵۔ سیماب اکبرآبادی	الہامِ منظوم جلد پنجم	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	
۶۔ سیماب اکبرآبادی	الہامِ منظوم جلد ششم	دین محمد پریس، بل روڈ لاہور	
۷۔ سیماب اکبرآبادی	نے ستاں	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۲۵ء
۸۔ سیماب اکبرآبادی	کارامروز	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۷ء
۹۔ سیماب اکبرآبادی	سازوآہنگ	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۱ء
۱۰۔ سیماب اکبرآبادی	سدرۃ المنتہیٰ	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۶ء
۱۱۔ سیماب اکبرآبادی	شعرانقلاب	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۷ء
۱۲۔ سیماب اکبرآبادی	عالم آشوب	مکتبہ قصرالادب، آگرہ	۱۹۴۴ء
۱۳۔ سیماب اکبرآبادی	سرودِ غم	مکتبہ پرچم، کراچی	۱۹۵۸ء
۱۴۔ سیماب اکبرآبادی	سازِ حجاز	سیماب اکیڈمی، پاکستان	۱۹۸۲ء
۱۵۔ سیماب اکبرآبادی	وحی منظوم	پرچم پرنٹنگ پریس، کراچی	س ن
۱۶۔ سیماب اکبرآبادی	نفیرِ غم	مکتبہ پرچم، کراچی	۱۹۵۸ء
۱۷۔ آل احمد سرور	ادب اور نظریہ	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۸۶ء
۱۸۔ آل احمد سرور	مسرت سے بصیرت تک	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۱۹۔ الطاف حسین حالی	مقدمۂ شعروشاعری	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۵۳ء

۲۰۔ احمد لاری	حسرت کی شاعری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۲۱۔ اختر انصاری	غزل اور درس غزل	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
۲۲۔ اسلوب احمد انصاری	ادب اور تنقید	سنگم پبلشرز، الہ آباد	۱۹۶۸ء
۲۳۔ انیس اشفاق	اردو غزل میں علامت نگاری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۵ء
۲۴۔ ثریا حسین (مرتبہ)	حسرت موہانی	شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۸۵ء
۲۵۔ جگر مرادآبادی	آتش گل	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۲۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۴ء
۲۷۔ خواجہ احمد فاروقی	ذوق و جستجو	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۷ء
۲۸۔ رشید احمد صدیقی	جدید غزل	شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۵۵ء
۲۹۔ عبادت بریلوی	جدید شاعری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۳ء
۳۰۔ عبدالقادر سروری	جدید اردو شاعری	مکتبہ عزم و عمل، کراچی	۱۹۶۶ء
۳۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد اوّل	ترقی اردو بیورو	۱۹۹۰ء
۳۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد دوم	ترقی اردو بیورو	۱۹۹۱ء
۳۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد سوم	ترقی اردو بیورو	۱۹۹۲ء
۳۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد چہارم	ترقی اردو بیورو	۱۹۹۳ء
۳۵۔ شمیم حنفی (مرتب)	فراق گورکھپوری شاعر اور شخص	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	۱۹۸۳ء
۳۶۔ عبدالرحمٰن	مراۃ الشعر	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۳۷۔ کامل قریشی	اردو غزل	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۲ء
۳۸۔ کلیم الدین احمد	عملی تنقید حصہ اول	اردو کتاب گھر، حیدرآباد	۱۹۸۱ء
۳۹۔ کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	بک امپوریم، پٹنہ	۱۹۸۵ء
۴۰۔ کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر جلد دوم	تیسرا ایڈیشن ایوان اردو، پٹنہ	۱۹۴۴ء

۴۱۔ کلیم الدین احمد	سخن ہائے گفتی	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۴۲۔ گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۹ء
۴۳۔ مالک رام (مرتبہ)	دیوان غالب	یادگار غالب کمیٹی	۱۹۶۹ء
۴۴۔ مجیب احمد	دیوان حالی مع شرح	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۳ء
۴۵۔ مرزا خلیل بیگ	زبان اسلوب اور اسلوبیات	ادارۂ زبان و اسلوب، علی گڑھ	۱۹۸۳ء
۴۶۔ نظیر صدیقی	جدید اردو غزل: ایک مطالعہ	گلوب پبلشرز، پاکستان	۱۹۸۴ء
۴۷۔ یوسف حسین خاں	اردو غزل	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۴۸۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی	کعبہ میں صنم خانہ	مکتبہ دین و ادب، لکھنؤ	۱۹۶۶ء
۴۹۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور	اردو شاعری کا انتخاب	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۱۹۶۰ء
۵۰۔ نورالحسن ہاشمی	ادب کیا ہے؟	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۶ء
۵۱۔ نورالرحمٰن	اکبر الہ آبادی اور ان کا کلام	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۶۴ء
۵۲۔ سید احتشام حسین	اعتبار نظر	کتاب پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۵۳۔ وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج	جدید ناشر، لاہور	۱۹۶۵ء
۵۴۔ وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
۵۵۔ علی جواد زیدی	اردو میں قومی شاعری کے ۱۰۰ سال	محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش، لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۵۶۔ ممتاز حسین	ادب اور شعور	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۱ء
۵۷۔ سلام سندیلوی	اردو رباعیات	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۳ء
۵۸۔ سلام سندیلوی	اردو شاعری میں منظر نگاری	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۵۹۔ سلام سندیلوی	اردو شاعری میں نرگسیت	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۴ء
۶۰۔ اختر حسین رائے پوری	ادب اور انقلاب	ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد	۱۹۵۴ء
۶۱۔ محمد حسن	ادبی تنقید	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۴ء

۶۲۔ محمد حسن	معاصر ادب کے پیش رو	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۶۳۔ محمد حسین آزاد	آبِ حیات	اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۸۶ء
۶۴۔ مجتبیٰ حسین	ادب اور آگہی	مکتبہ افکار، کراچی	۱۹۹۶
۶۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی	فکر و فن	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۶ء
۶۶۔ ڈاکٹر عزیز احمد	سماجی شاعری	شاہین بک اسٹال، سرینگر	۱۹۶۴ء
۶۷۔ محمد یوسف کتھری (مرتبہ)	تغزل	خیاباں پبلی کیشنز	۱۹۷۹ء
۶۸۔ سردار جعفری (مرتب)	منتخب قومی شاعری	نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا	۱۹۷۳ء
۶۹۔ شبلی نعمانی	سوانح مولانا روم	مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ	۱۹۳۸ء
۷۰۔ شارق میرٹھی	اردو شاعری کی روایت	شیو پریس، میرٹھ	۱۹۵۶ء
۷۱۔ عنوان چشتی	اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	اردو سماج، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۷۲۔ عنوان چشتی	اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۷۵ء
۷۳۔ روشن اختر کاظمی	اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۳ء
۷۴۔ اردو اکادمی	اردو نظم ۱۹۶۰ء کے بعد	اردو اکادمی	۱۹۹۵۔۲۰۰۶ء
۷۵۔ طالب الہ آبادی	اکبر الہ آبادی	مطبع انوار احمدی، الہ آباد	س ن
۷۶۔ نیاز فتح پوری	انتقادیات	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ	۱۹۴۴ء
۷۷۔ عبدالستار دلوی	انتخابِ کلام چکبست	عارف پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۴۳ء
۷۸۔ تلوک چند محروم	بہارِ طفلی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	۱۹۶۰ء
۷۹۔ مشیر فاطمہ	بچوں کے ادب کی خصوصیات	انجمن ترقی علی گڑھ	۱۹۶۲ء
۸۰۔ فرمان فتح پوری	تحقیق و تنقید	ماڈرن پبلشرز، کراچی	۱۹۶۳ء
۸۱۔ عزیز احمد	ترقی پسند ادب	ادارۂ اشاعت، لاہور	۱۹۴۵ء
۸۲۔ ابو محمد سحر	تنقید و تجزیہ	کتابستان الہ آباد	۱۹۶۱ء

۸۳۔ عبادت بریلوی	تنقیدی تجزیے	اردو دنیا، کراچی	۱۹۵۹ء
۸۴۔ احتشام حسین	تنقیدی جائزے	احباب پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۵۶ء
۸۵۔ اختر اورینوی	تحقیق و تنقید	کتابستان، الہ آباد	۱۹۶۱ء
۸۶۔ جلیل قدوائی	تنقیدیں اور خاکے	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۵۲ء
۸۷۔ ابواللیث صدیقی	تجزیے اور روایت	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۵۹ء
۸۸۔ ابواللیث صدیقی	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۸ء
۸۹۔ آلِ احمد سرور	تنقید کیا ہے؟	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۵۹ء
۹۰۔ سید احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۲ء
۹۱۔ جگن ناتھ آزاد	تلوک چند محروم	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۹۲۔ عزیز احمد	تنقیدی زاویے	شاہین بک اسٹال، سرینگر	۱۹۶۰ء
۹۳۔ شجاعت علی سندیلوی	تعارف تاریخ اردو	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۳ء
۹۴۔ شجاعت علی سندیلوی	حالی بحیثیت شاعر	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۰ء
۹۵۔ مالک رام	ذکر غالب	مکتبہ جامعہ، دہلی	۱۹۵۵ء
۹۶۔ سید احتشام حسین	ذوق ادب اور شعور	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۹۷۔ سید احتشام حسین	روایت اور بغاوت	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۶ء
۹۸۔ ظ۔ انصاری	زبان و بیان	آزاد کتاب گھر، دہلی	۱۹۵۹ء
۹۹۔ محی الدین قادری زور	روح تنقید	مکتبہ معین الادب، لاہور	۱۹۶۰ء
۱۰۰۔ مجنوں گورکھپوری	شعر اور غزل	ادبی اکیڈمی، کراچی	س ن
۱۰۱۔ مولانا عبدالسلام ندوی	شعر الہند حصہ اوّل	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۸ء
۱۰۲۔ مولانا عبدالسلام ندوی	شعر الہند حصہ دوم	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۳۸ء
۱۰۳۔ چکبست	صبح وطن	انڈین پریس، الہ آباد	۱۹۲۸ء

۱۰۴۔ عبادت بریلوی	غزل اور مطالعۂ غزل	انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان	۱۹۵۵ء
۱۰۵۔ اختر اورینوی	قدر و نظر	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۱۰۶۔ حالی	کلیات حالی	جدید کتاب گھر، دہلی	۱۹۶۰ء
۱۰۷۔ اکبر الہ آبادی	کلیاتِ اکبر حصہ اوّل	سنٹرل بک ڈپو، دہلی	۱۹۱۲ء
۱۰۸۔ اکبر الہ آبادی	کلیاتِ اکبر حصہ دوم	ادبی پریس، الہ آباد	۱۹۳۱ء
۱۰۹۔ تلوک چند محروم	گنجِ معانی	کتاب گھر دہلی	۱۹۵۷ء
۱۱۰۔ حکیم سید عبدالحئی	گلِ رعنا	مطبع معارف پریس، اعظم گڑھ	۱۹۴۳ء
۱۱۱۔ ڈاکٹر اعجاز حسین	مذہب اور شاعری	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۵۵ء
۱۱۲۔ آل احمد سرور	نئے پرانے چراغ	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵ء
۱۱۳۔ محمد حسین آزاد	نیرنگ خیال	مکتبہ کلیاں، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
۱۱۴۔ شبلی نعمانی	موازنۂ انیس و دبیر	الناظر پریس، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
۱۱۵۔ عبدالمغنی	نقطۂ نظر	کتاب منزل، پٹنہ	۱۹۶۵ء
۱۱۶۔ عبادت بریلوی	روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان	۱۹۵۳ء
۱۱۷۔ سید مسعود حسن رضوی	ہماری شاعری	راجہ رام پریس، لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۱۱۸۔ عزیز احمد	ہماری قومی اور انقلابی شاعری	شاہین بک اسٹال، سرینگر	۱۹۶۰ء
۱۲۰۔ سید ابوالعاصم رضوی	اردو ادب کی تاریخ حصہ اوّل نظم	مجلس ترقی اردو، دہلی	۱۹۷۵ء
۱۲۱۔ صفیہ پروین	اصغر گونڈوی: حیات و شاعری	تنویر پریس، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۱۲۲۔ ڈاکٹر ملک احسان	تاریخ ادب اردو، طبع دوم	ابلاغ، لاہور	۱۹۹۶ء
۱۲۳۔ راز چاند پوری	داستان چند	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۱۲۴۔ راز چاند پوری	داستانِ عہد گل	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۱ء
۱۲۵۔ ضیا فتح آبادی	ذکرِ سیماب	بزم سیماب، دہلی	۱۹۸۴ء

۱۲۶۔ زرینہ ثانی — سیماب کی نظمیہ شاعری — سیماب اکاڈمی — ۱۹۷۸ء

۱۲۷۔ سید احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ چوتھا ایڈیشن — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی — ۱۹۹۹ء

۱۲۸۔ سلیم اختر — اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور — ۱۹۹۳ء

۱۲۹۔ انور سدید — اردو ادب کی مختصر تاریخ — مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد — ۱۹۹۱ء

۱۳۰۔ خلیفہ عبدالحکیم — تشبیہات رومی — ادارۂ ثقافت اسلامیہ، پاکستان — ۱۹۰۹ء

۱۳۱۔ رام بابو سکسینہ — تاریخ اردو ادب — بزم خضر راہ، نئی دہلی — ۲۰۰۰ء

۱۳۲۔ جمیل جالبی — ارسطو سے ایلیٹ تک — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ — ۱۹۷۷ء

۱۳۳۔ اعجاز حسین — مختصر تاریخ ادب اردو — اردو کتاب گھر، دہلی — ۱۹۳۴ء

۱۳۴۔ قاضی تلمذ حسین — مولانا جلال الدین رومی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۰۷ء

۱۳۵۔ نورالحسن نقوی — فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ — ۲۰۰۱ء

۱۳۶۔ محمد صادق — A History of Urdu Literature

۱۳۷۔ ابوالکلام آزاد — India Wins Freedom

۱۳۸۔ سید اے لطیف — Literature on Urdu Literature

۱۳۹۔ کالی داس گپتا — چکبست اور باقیات چکبست — ولی پبلی کیشنز، بمبئی — ۱۹۷۹ء

۱۴۰۔ قاضی مشتاق احمد — اردو شاعری میرؔ سے پروین شاکر تک — مکتبہ جدید، نئی دہلی — ۲۰۰۲ء

۱۴۱۔ مولانا قاضی سجاد حسین — مثنوی مولوی معنوی دفتر اول — سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۱۹۷۴ء

۱۴۲۔ مولانا قاضی سجاد حسین — مثنوی مولوی معنوی دفتر دوم — سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۱۹۷۶ء

۱۴۳۔ مولانا قاضی سجاد حسین — مثنوی مولوی معنوی دفتر سوم — سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۱۹۷۶ء

۱۴۴۔ مولانا قاضی سجاد حسین — مثنوی مولوی معنوی دفتر چہارم — سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۱۹۷۷ء

۱۴۵۔ مولانا قاضی سجاد حسین — مثنوی مولوی معنوی دفتر پنجم — سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۱۹۷۸ء

۱۴۶۔ مولانا قاضی سجاد حسین — مثنوی مولوی معنوی دفتر ششم — سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۱۹۷۸ء

۱۴۷۔ مولوی محمد یوسف علی مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی اول منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۴۸۔ مولوی محمد یوسف علی مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی دوم منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۴۹۔ مولوی محمد یوسف علی مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی سوم منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۵۰۔ مولوی محمد یوسف علی مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی چہارم منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۵۱۔ مولوی محمد یوسف علی مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی پنجم منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۵۲۔ مولوی محمد یوسف علی مثنوی مولوی معنوی، پیراہن یوسفی ششم منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۵۳۔ عبدالمجید خاں بوستانِ معرفت مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ س ن

۱۵۴۔ محمد عبدالرحمٰن راسخ کتاب مرقوم حصہ دوم، دفتر اول احسن المطابع، دہلی س ن

۱۵۵۔ محمد عبدالرحمٰن راسخ کتاب مرقوم حصہ اول، دفتر اول احسن المطابع، دہلی س ن

۱۵۶۔ عقیل احمد صدیقی اردو نظم: نظریہ اور عمل ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۰ء

۱۵۷۔ شارب ردولوی افکار سودا مرتبہ حمیدہ قیصر، لکھنؤ ۱۹۶۱ء

۱۵۸۔ ابواللیث صدیقی نظیر اکبرآبادی کا عہد اور شاعری

۱۵۹۔ بانی کنول کرشن آزاد نظم اردو شاعری میں کتاب پبلشرز، لکھنؤ س ن

۱۶۰۔ صالحہ عابد حسین یادگار حالی انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۴۹ء

۱۶۱۔ حنیف کیفی اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم حنیف کیفی، دہلی ۱۹۸۲ء

۱۶۲۔ شوکت سبزواری اردو زبان کا ارتقاء اردو مرکز، دہلی س ن

۱۶۳۔ رفیع الدین اشفاق اردو میں نعتیہ شاعری اردو اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۶ء

۱۶۴۔ شمیم حنفی نئی شعری روایت مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء

۱۶۵۔ کشفی ابوالخیر اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ادبی پبلشرز، کراچی ۱۹۷۵ء

۱۶۶۔ قاضی عبدالستار اردو شاعری میں قنوطیت مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۶۳ء

۱۶۷۔ جمیل جالبی تاریخ ادب اردو

۱۶۸۔ ڈاکٹر قمر رئیس (مرتب) ترجمہ کا فن اور روایت تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۷۶ء
۱۶۹۔ خلیق انجم (مرتبہ) فنِ ترجمہ نگاری انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۹۶ء

رسائل واخبارات

۱۔ تحریک، جگر نمبر، نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۶۰ء
۲۔ شاہکار، فراق نمبر، بجنور، ۵۶۔۱۹۵۵ء
۳۔ علی گڑھ میگزین، مجاز نمبر، علی گڑھ ۵۶۔۱۹۵۵ء
۴۔ افکار، جوش نمبر، کراچی، اکتوبر۔نومبر ۱۹۶۱ء
۵۔ احسن، سیماب نمبر، رام پور، مئی ۱۹۵۱ء
۶۔ الوارث، سیماب نمبر، بمبئی، جنوری۔فروری ۱۹۴۹ء
۷۔ علی گڑھ میگزین، فانی نمبر، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۱ء
۸۔ نقد ونظر، اقبال نمبر، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء
۹۔ نقد ونظر، فانی نمبر، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء
۱۰۔ نگار، حسرت نمبر، کراچی، ۱۹۸۱ء
۱۱۔ نگار، نظیر نمبر، کراچی، دسمبر ۱۹۴۴ء
۱۲۔ نگار، اقبال نمبر، کراچی
۱۳۔ نگار، اصناف سخن نمبر، سالنامہ، کراچی، جنوری۔فروری ۱۹۵۷ء
۱۴۔ نگار، کراچی، اپریل، ۱۹۵۵ء
۱۵۔ نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۴۲ء
۱۶۔ نگار، کراچی، دسمبر ۱۹۴۴ء
۱۷۔ نگار، کراچی، جنوری۔فروری ۱۹۴۱ء

۱۸۔ نگار، کراچی، جولائی ۱۹۴۴ء

۱۹۔ نگار، کراچی، نومبر ۱۹۴۴ء

۲۰۔ نگار، کراچی، اگست ۱۹۴۷ء

۲۱۔ نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۴۷ء

۲۲۔ نگار، کراچی، نومبر، ۱۹۴۱ء

۲۳۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۳۵ء

۲۴۔ نگار، کراچی، مئی ۱۹۳۵ء

۲۵۔ پرچم، تعزیت نمبر، کراچی، ۱۹۵۱ء

۲۶۔ تاج، منظوم نمبر، آگرہ، جنوری ۱۹۳۰ء

۲۷۔ زمانہ، کانپور، مارچ ۱۹۳۵ء

۲۸۔ زمانہ، کانپور، جون ۱۹۳۶ء

۲۹۔ پیمانہ، جلد ۷ تا ۱۰، آگرہ، مئی ۱۹۳۰ء، نومبر ۱۹۳۰ء

۳۰۔ کتاب نما، نئی دہلی، اپریل ۱۹۸۴ء

۳۱۔ اردو نامہ، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۴ء

۳۲۔ شاعر، کارامروز نمبر، آگرہ، جولائی ۱۹۳۵ء

۳۳۔ شاعر، آگرہ، اسکول نمبر، آگرہ، ۱۹۳۷ء

۳۴۔ شاعر، خاص نمبر، بمبئی، ۱۹۵۸ء

۳۵۔ شاعر، خاص نمبر، بمبئی، ۱۹۶۳ء

۳۶۔ شاعر، سالنامہ، بمبئی، ۱۹۶۴ء

۳۷۔ شاعر، سالنامہ، آگرہ، اپریل ۱۹۴۲ء

۳۸۔ شاعر، خاص نمبر، بمبئی، جنوری ۱۹۴۹ء

۳۹۔ شاعر، سالنامہ۔ بمبئی، مئی ۱۹۳۷ء

۴۰۔ شاعر، سالنامہ، بمبئی، ۱۹۵۰ء

۴۱۔ شاعر، خاص نمبر، بمبئی، اپریل ۱۹۶۴ء

۴۲۔ شاعر، خاص نمبر، بمبئی، اگست۔ ستمبر ۱۹۶۱ء

۴۳۔ مدینہ، بجنور، فروری ۱۹۳۵ء

۴۴۔ شاہکار، بجنور، مئی ۱۹۳۵ء

۴۵۔ شاہکار، بجنور، اپریل ۱۹۳۷ء

۴۶۔ ریویو، ہندوستانی، الہ آباد، جنوری ۱۹۳۵ء

۴۷۔ شاعر، آگرہ، جنوری ۱۹۳۷ء

۴۸۔ شاعر، آگرہ، مارچ۔ اپریل، ۱۹۳۵ء

۴۹۔ شاعر، آگرہ، فروری ۱۹۳۵ء

۵۰۔ شاعر، آگرہ، جنوری ۱۹۳۵ء

۵۱۔ شاعر، بمبئی، اگست۔ ستمبر ۱۹۶۱ء

۵۲۔ شاعر، آگرہ، جنوری تا مارچ ۱۹۳۳ء

۵۳۔ شاعر، آگرہ، ستمبر تا دسمبر ۱۹۳۵ء

۵۴۔ شاعر، سالنامہ، بمبئی، ۱۹۶۰ء

۵۵۔ شاعر، آگرہ، مئی۔ جون ۱۹۳۵ء

۵۶۔ شاعر، آگرہ، مارچ ۱۹۳۳ء

۵۷۔ شاعر، بمبئی، مارچ ۱۹۶۴ء

۵۸۔ شاعر، آگرہ، جنوری تا دسمبر ۱۹۳۴ء

۵۹۔ شاعر، سالنامہ، بمبئی، ۱۹۶۶ء

۶۰۔ آج کل، نئی دہلی، فروری ۱۹۸۳ء

۶۱۔ آج کل، نئی دہلی، جنوری ۱۹۶۷ء

۶۲۔ آج کل، نئی دہلی، جون ۱۹۵۳ء

۶۳۔ آج کل، نئی دہلی، جولائی ۱۹۵۳ء

۶۴۔ آج کل، نئی دہلی، اگست۔ستمبر ۱۹۸۱ء

۶۵۔ ماہِ نو، کراچی، مارچ ۱۹۶۴ء

۶۶۔ آج کل نئی دہلی، دسمبر ۱۹۴۴ء

۶۷۔ اسپین، نئی دہلی، مئی۔جون ۲۰۰۵ء

۶۸۔ ایوان اردو، سردار جعفری نمبر، نئی دہلی، ستمبر ۲۰۰۰ء

۶۹۔ آج کل، سالنامہ، نئی دہلی، یکم جون ۱۹۴۶ء

۷۰۔ زمانہ، کانپور، مارچ۔اپریل ۱۹۴۹ء

۷۱۔ کتاب نما، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، فروری ۲۰۰۹ء

۷۲۔ آج کل، نئی دہلی، ستمبر ۱۹۵۵ء